دینی مدارس، اخلاقی قدریں اور روح عصر
مدرسہ دارالعلوم کی خدمات پر ایک نظر

مدرسہ کے قیام پر ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اس کا نہ صرف ملک کے دینی حلقوں میں نام لیا جانے لگا، بلکہ سرکاری دانش گاہوں (۱) میں بھی ذکر آنے لگا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ برطانوی ہندوستان میں یہ شاید پہلا دینی مدرسہ تھا جس میں تعلیم ایک نظم و ضبط کے ساتھ دی جا رہی تھی، اس میں امتحان کا طریقہ رائج تھا، طالب علموں کی جماعت بندی بھی کی گئی تھی اور طالب علموں کا داخلہ بھی بڑے حزم و احتیاط سے کیا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب جو عربی کالج، دہلی، کے طالب علم رہ چکے تھے۔ کالج کے نظم و نسق سے متاثر تھے۔(۲) اس بات کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ سرکاری رپورٹوں میں عربی مدارس کی بدنظمی اور علمی ابتری کا بھی تذکرہ آیا ہے، چنانچہ یہ لوگ مذہبی اداروں کی انتظامی اور علمی ویرانی کو قریب سے دیکھ چکے تھے، یہ امر محتاج بیان نہیں کہ مسلم معاشرہ ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ہی روبہ زوال ہو چکا تھا، اس کی صحت مند دینی اور اخلاقی زندگی کی رونق ماند پڑ چکی تھی۔ علماء اور مشائخ بقول شاہ ولی اللہ دہلوی یہود و نصاریٰ کے علماء و مشائخ کی صحیح تصویر تھے۔

انہوں نے اپنی نفس پرستیوں اور بوالعجبیوں کا نام مذہب رکھ چھوڑا تھا۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے نامور بیٹوں نے اسلام کو اس کی پہلی سی سادگی و

رعنائی میں دیکھنا چاہا۔ اس کے لیے انہوں نے فکری اور عملی طور پر سعی پیہم بھی کی، جس کے نتیجہ میں: "دعوت و اصلاح امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کر دیئے گئے تھے، اب اس سلطان وقت و اسکندر عزم کی بدولت شاہ جہاں آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے، جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی، وہ اب بر سر بازار کی جا رہی اور ہو رہی تھی اور خون شہادت کے چھینٹے حرف و حکایات کو نقوش و سواد بنا کر صفحہ عالم پر ثبت کر رہے تھے۔

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم
حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم"(۲)

بے شبہ ولی اللہی خاندان نے "آسمان سے حجت تمام کرنے میں" اسلاف کی یاد تازہ کر دی، لیکن مذہبی زندگی عمومی طور پر تقلید و جمود اور بدعات و توہمات کے دائرہ سے باہر نکلنے پر تیار نہ ہوئی۔ اخلاقی پستی کا یہ عالم تھا کہ ایک مذہبی گروہ کا آدمی دوسرے مسلک کے آدمی کی بیوی تک کو اغوا کرنا جائز تصور کرتا تھا، سید عبدالحی مرحوم نے "ارمغان احباب" میں لکھا ہے کہ دہلی میں ایک مسجد کے امام نے کسی کی بیوی کو اغوا کر لیا، جب محلّہ کے سنجیدہ آدمیوں نے صحیح صورت حال سے آگاہ ہونا چاہا، تو مولوی صاحب نے کہا: "یہ لوگ یعنی حنفی المذہب، مستحل الدم ہیں (ان کا خون بہانا جائز ہے) ان کا مال مال غنیمت ہے، ان کی بیویاں ہمارے واسطے جائز ہے۔"(۴) ایسے ہی احناف کے حلقوں میں تاثر پایا جاتا تھا کہ "آپ (ایک معروف محدث جس نے دہلی میں ساٹھ سال تک حدیث شریف کا درس دیا) حنفیہ کو بدتر از ہنود کہتے ہیں"(۵) تنگ نظری

اور مذہبی فرقہ واریت کا یہ حال تھا کہ ایک ہی مسجد میں ایک ہی مسلک کے آدمی مل کر نماز نہیں پڑھ سکتے تھے' ایک گروہ پر مساجد کے دروازے بند کرنے کیلئے "جامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد" کے نام سے کتابیں لکھی گئیں۔ جس پر بڑے بڑے علماء کے دستخط ثبت تھے۔(۶) آفت پہ آفت یہ آئی کہ بعض اوقات یہ مذہبی جھگڑے مسمانوں کو برطانوی عدالتوں میں بھی لے گئے جس پر پوری جماعت کی بڑی سبکی ہوئی۔ القصہ عربی مدارس کی بد نظمی' اخلاقی زندگی کی ویرانی اور مذہبی فرقہ واریت کی ہولناکی حاجی سید محمد عابد' مولانا محمد قاسم اور ان کے قریبی ساتھیوں کی نگاہ میں تھی' چنانچہ حاجی صاحب مرحوم اور ان کے ساتھیوں نے نئے مدرسہ کی انتظامیہ' اساتذہ اور طلبہ کو سختی سے قواعد و ضوابط کاپابند بنایا۔

۲۔ ملک کے سنجیدہ حلقوں میں مدرسہ کی نیک نامی کی ایک دوسری وجہ اہل مدرسہ کی پاکیزہ زندگیاں تھیں' جو ایک کھلی ہوئی کتاب تھیں' جس کا ہر ورق نام و نمود' غرور و پندار اور ہوا و ہوس کے ہر دھبہ سے پاک تھا۔ ایک طرف مردہ روحیں تھیں جنھوں نے اپنی دنیا پرستی کو مذہب قرار دے رکھا تھا' دوسری طرف حاجی محمد عابد' محمد قاسم اور ان کے ساتھی تھے' جو خاموشی اور انکساری سے درس و تدریس اور تربیت و تزکیہ کے بے رونق حلقوں کو آباد کر رہے تھے۔ان کی باوقار روش سے لوگ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے' ان کی اجلی سیرتیں قدیم صوفیائے کرام کی یاد لاتی تھیں' جو اہل دربار اور اصحاب قیل و قال سے دور رہ کر اپنی عمدہ سیرتوں کی زبانی وعظ کہتے تھے' وہ علمائے سوء سے کہا کرتے: تم نے مردہ علم مردہ انسانوں سے حاصل کیا ہے' ہم نے زندہ علم' زندہ لوگوں سے کسب کیا ہے۔" معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کے بانی حضرات' خاص طور پر حاجی سید محمد عابد اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مسجد میں بساط تدریس

بچھانے سے پہلے بڑی ریاضت سے اپنے غرور نفس پر قابو پالیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی زندگیوں میں زہد و تقویٰ کی نمائش اور علم و فضل کی تشہیر کی بجائے تواضع، اخلاص اور خدا ترسی کے آثار دیکھتے ہیں، چنانچہ جو کوئی ان سے ملا، ایک ہی نگاہ میں انہی کا ہو کر رہ گیا، جب مولانا نانوتوی نے ۱۸۸۰ء میں انتقال کیا تو ان کے معاصر سرسید احمد مرحوم نے جو علمائے دیوبند کے مذہبی افکار سے اختلاف رکھتے تھے، بڑے درد و کرب سے لکھا: "افسوس ہے کہ جناب ممدوح (مولانا نانوتوی) نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آوے، نہایت رنج و غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ انہوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں، ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے۔

... ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز سے کچھ کم ہو، الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا، مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحاق سے بڑھ کر نہ تھا، تو کم بھی نہ تھا، درحقیقت وہ فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے۔" (۷) غرضیکہ ارباب مدرسہ کی یہی پاکیزہ زندگیاں تھیں، جن سے مدرسہ کی شہرت، نیک نامی اور مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا۔ قیام مدرسہ کے بعد شمالی ہندوستان میں اور بھی دینی اداروں نے بڑے جوش و خروش سے اصلاح امت کا کام شروع کیا تھا، لیکن انہیں مسلمانوں میں مدرسہ دیوبند کا مقام حاصل نہ ہو سکا۔ مثلاً" ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی، جس نے بڑی نیک تمناؤں کے

ساتھ کام شروع کیا' بعد میں مولانا شبلی مرحوم نے عام جلسوں میں فرمایا: "اگر اس وقت کوئی چیز مرجع بن سکتی ہے' جو سنٹر قرار دیا جا سکتا ہے' تو وہ ندوہ ہے۔" مولانا مرحوم کے ان دعوؤں پر شیخ محمد اکرام نے تعجب سے لکھا: دیوبند کے ہوتے ہوئے "الندوہ" کے صفحات میں (مولانا) دعویٰ کرنے لگے کہ "ندوۃ العلماء" تمام ہندوستان میں سب سے بڑی مقتدر مذہبی جماعت ہے۔"(۸) اس میں شک نہیں کہ مولانا شبلی مدرسہ دیوبند کے نصاب تعلیم سے خوش نہیں تھے' جس کا اظہار انہوں نے اپنے مکاتیب میں کیا ہے' لیکن ان کا یہ اختلاف ان کی طبع حق پرست پر اثر انداز نہ ہو سکا' انہوں نے ارباب دیوبند کے اخلاص و تقویٰ کا کھل کر اعتراف کیا اور کہا: "ارباب دیوبند نہایت زاہد اور متقشف ہیں' ان کے ساتھ وسیع النظر بھی نہیں ہیں' تاہم چونکہ مخلص ہیں' اس لیے شور و شر نہیں مچاتے' کوئی پوچھتا ہے تو جو جانتے ہیں بتا دیتے ہیں۔"(۹) شبلی ایک دوسرے مکتوب میں مولانا محمود حسن کے بارے میں لکھتے ہیں: "باوجود اس کے بہتر ہے کہ کوئی عالم (میرے مسودۂ سیرت پر) نظرثانی کر لیں کہ ملک کے اعتماد کا باعث ہو' مولوی محمود حسن دیوبندی مسلم شخص ہیں' میری نسبت ان کی جو رائے ہو لیکن وہ کوئی رائے دیانت کے خلاف نہ دیں گے۔"(۱۰) اخلاق و کردار کی یہی بلندی تھی' جس کی وجہ سے مدرسہ دیوبند مسلم جماعت میں ایک اخلاقی اور روحانی طاقت کی حیثیت سے ابھرا اور ایک لمبی مدت تک اس کے اس مقام کو وقت کی کوئی آزمائش اور گردش لیل و نہار کا کوئی حادثہ چیلنج نہیں کر سکا۔ اس کی بنیادی وجہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے کہ مدرسہ اپنے قیام سے لے کر ہمارے عہد تک ایسے لوگ پیدا کرنے میں کامیاب رہا جن کی زندگیوں کا امتیازی نشان خدا ترسی' حق پرستی اور حق گوئی رہا۔

کہا جاتا ہے کہ جب مولانا محمود حسن سے' جو برطانوی استعمار کے

سخت خلاف تھے‘ ۱۹۱۹ء کی تحریک ترک موالات (NON-CO-OPERATION) سے متعلق ایک سوال پوچھا گیا تو آپ نے اپنے ممتاز شاگردوں کو۔ مولانا شبیر احمد عثمانی‘ مفتی کفایت اللہ دہلوی‘ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ بلا کر کہا: یہ فتویٰ آپ لوگ لکھیں اس لیے کہ مجھ میں انگریزوں سے نفرت کا جذبہ شدت لیے ہوئے ہے‘ مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے کہ حدود کی رعایت ہو سکے گی‘ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"لایجرمنکم شنان قوم ان لاتعدلوا"

(دیکھنا کسی قوم کی دشمنی تمہیں جادۂ عدل سے نہ ہٹا دے) اس لیے آپ ہی لوگ لکھیں۔" حق سے یہ مضبوط پیمان وفا اور عدل و انصاف سے یہ گہرا رشتہ وہی لوگ قائم کرتے ہیں جو دنیا میں سچائی اور حق پر ایمان اور آخرت کی زندگی پر گہرا اعتقاد رکھتے ہیں۔ ارباب دیوبند نے مذہبی مسائل میں بھی مقدور بھر رواداری اور وسعت ظرف کا ثبوت دیا اور اختلاف رائے کے فطری حق کو تسلیم کیا۔ حالیہ وقت میں میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مسئلہ پر مسلمانوں کے دو فریقوں میں جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے‘ وہ محتاج بیان نہیں‘ لیکن جب مولانا نانوتوی سے پوچھا گیا‘ تو انہوں نے کہا: "بھائی! میلاد شریف نہ اتنا برا ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں اور نہ اتنا اچھا ہے جتنا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔" (۱۱) ایسے ہی جب مولانا اشرف علی تھانوی سے کہا گیا کہ فلاں عالم نے آپ کو گستاخ رسولؐ جان کر کافر کہا ہے‘ تو مولانا نے کہا: ممکن ہے کہ ان کی (جنھوں نے مولانا تھانوی کو کافر کہا تھا) مخالفت کا سبب حب رسولؐ ہی ہو اور غلط فہمی سے ہم لوگوں کو نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخ ہی سمجھتے ہوں۔" (۱۲) اپنے حریف عالم کے فتویٰ کفر کے صحیح سبب کا سراغ لگانے کی کوشش کرنا اور اس کی عمدہ توجیہ کرنا تاریخ مذہب کا یقیناً قابل

تذ رو اقعہ ہے۔

مدرسہ کی یہی اخلاقی و روحانی طاقت تھی کہ مسلمانوں نے اپنے مذہبی مسائل میں مدرسہ کی طرف رجوع کیا' چنانچہ وہ عبادات اور معاملات سے متعلق مسائل میں ارباب دیوبند سے استفسار کرتے رہے' قیام مدرسہ کے بعد مولانا محمد یعقوب درس و تدریس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دینی مسائل کے جوابات بھی دیتے تھے۔ لیکن جب پورے ملک سے سوالات کی یورش ہوئی تو ۱۳۱۰ھ میں یعنی قیام مدرسہ سے ستائیس سال بعد دارالافتاء قائم کیا گیا اور اس کام کے لیے نظر انتخاب مفتی عزیز الرحمان پر پڑی۔ مفتی صاحب بھی خوش قسمتی سے مدرسہ کے پہلے قبیلہ عشاق سے تعلق رکھتے تھے۔ وہی حق سے گہرا رشتہ' وہی تواضع و انکساری' وہی پڑوسیوں کی خدمت کا پاکیزہ جذبہ۔ کہا جاتا ہے کہ مفتی صاحب زندگی بھر پاؤں پھیلا کر نہیں سوئے' پوچھا گیا تو کہا: "پاؤں پھیلانے کی جگہ دنیا نہیں قبر ہے۔"(۱۳) ہر چند مفتی صاحب کے عہد کا پورا ریکارڈ محفوظ نہیں رہا لیکن ان کے عہد میں تقریباً" ایک لاکھ اٹھارہ ہزار فتاوی جاری کئے گئے' دارالافتاء کے ریکارڈ کے مطابق ۱۳۳۰ھ سے لے کر ۱۳۹۶ھ تک یعنی چھیاسٹھ سال میں مدرسہ سے جاری کئے گئے فتاوی کی تعداد چار لاکھ انتالیس ہزار تین سو چھتیس (۴۳۹۳۳۶) ہے۔ اس ریکارڈ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دارالافتاء کتنی مہم اور نازک ذمہ داری انجام دے رہا ہے۔

مقام مسرت ہے کہ مدرسہ نے مفتی صاحب مرحوم کے فتاوی کو کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے' مفتی صاحب کے علاوہ مدرسہ سے تعلق رکھنے والے دوسرے اہل علم مثلاً" مولانا رشید احمد گنگوہی' مولانا اشرف علی تھانوی اور مفتی کفایت اللہ دہلوی کے فتاوی بھی شائع ہو چکے ہیں' ان مجموعوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ فتاوی کا تعلق نہ صرف عبادات' معاملات شخصی مسائل اور

عقائد سے ہے، بلکہ عہد حاضر کی ملکی سیاست سے بھی ہے، مثلاً" کانگریس، مسلم لیگ، احرار، خاکسار اور جمعیت علمائے ہند کی سیاست سے متعلق جوابات احتیاط سے دیئے گئے ہیں، ان فتاوی سے یہ امر بھی عیاں ہے کہ مدرسہ دینی اور شرعی امور میں روایت پسند واقع ہوا ہے۔ یعنی وہ کتاب و سنت کی تشریح و تاویل آثار سلف کی روشنی میں کرتا ہے اور ضعیف سے ضعیف اثر یا روایت کو بھی ترک کرنا پسند نہیں کرتا، لیکن فقہ میں ارباب افتاء نے فقہ حنفی کا دامن بڑی سختی سے پکڑ رکھا ہے، حتی کہ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ اصحاب افتاء کے قدم جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے ہیں، جس کا ایک سبب شاید تقلید میں شدت ہے اور معاشرہ کے مسائل اور ان کی سنگینی سے بے خبری۔ ہم یہاں صرف دو مثالوں کا ذکر کریں گے، نماز میں فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ ہماری فقہ کا مشہور مسئلہ ہے، علماء احناف کے ہاں امام کے پیچھے فاتحہ کا پڑھنا ناجائز ہے، جب کہ امام شافعی اور دوسرے علماء کے ہاں فاتحہ کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی۔ صحیحین (بخاری و مسلم) کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ "لاصلاۃ لمن لم یقرا بفاتحہ الکتاب" جس نے (نماز میں) فاتحہ نہیں پڑھی، اس کی نماز نہیں ہے۔ علمائے احناف نے سورۃ اعراف کی آیت "واذ قری القرآن فاستمعوالہ وانصتوا" (جب قرآن پڑھا جائے تو اسے پوری توجہ سے سنو) سے استدلال کیا ہے کہ امام کی اقتداء میں فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے، شاہ ولی اللہ جن سے علمائے دیوبند کو گہری عقیدت ہے، فاتحہ خلف الامام کے حق میں ہیں، ایک صاحب نے اپنے استفسار میں شاہ صاحب کا ذکر کیا تو مفتی صاحب نے جواب میں لکھا کہ شاہ صاحب کی جو بھی رائے ہو ہمیں اپنے امام کی تقلید کرنی چاہیے، فرماتے ہیں: "حنفی کو امام کے پیچھے سورہ فاتحہ وغیرہ کچھ نہ پڑھنی چاہیے اور شاہ ولی اللہ جیسا محقق اگر کسی مسئلہ میں اختلاف کریں تو اوروں کے لیے یہ

فعل درست نہیں ہے، ان کو اپنے امام کی تقلید کرنی چاہیے، خصوصاً" جب کہ دلائل سے بھی مذہب امام قوی ہو فقط۔"(۱۴)

ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا مسئلہ ایسا ہے، جس نے برصغیر میں مسلمانوں کے لیے بڑی مشکلات پیدا کی ہیں۔ حلالہ کے نام سے ایسا مکروہ کاروبار وجود میں آیا ہے، جس پر شریعت مقدسہ، اخلاق فاضلہ اور روحانی اقدار برابر ماتم کر رہی ہیں، ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ رسول اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد مبارک میں، ایسے ہی عہد فاروقی کے پہلے دو سالوں میں یہ تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھیں، حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں ایسا ہی آیا ہے، جب تین طلاق کی وبا پھیلی تو حضرت عمرؓ نے اسے تعزیراً" موثر قرار دیا تاکہ لوگ اس سے بچیں، ابن قیم نے ابن تیمیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے اجتہاد پر جس سے وابستہ نتائج برآمد نہیں ہوئے، نادم تھے، ابن تیمیہ نے مزید لکھا ہے کہ آج مسلم معاشرہ جن حالات سے دوچار ہے اگر حضرت عمرؓ اسے دیکھ لیتے تو وہ عہد رسولؐ کی پیروی کرتے ہوئے ایک ہی طلاق کو دوبارہ رائج کر دیتے۔(۱۵) ابن تیمیہ کی اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر معروف دوالبی نے "المدخل الی اصول الفقہ" (دمشق ۱۹۵۵ء) میں لکھا ہے کہ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ حکم بھی بدل جاتا ہے، (الاحکام تتغیر بتغیر الزمان) اس اصول کی بنا پر مصر نے اپنے قانون میں تبدیلی کر دی ہے اور اب وہاں تین طلاق ایک ہی طلاق شمار ہوتی ہیں۔" جب اس طلاق کے بارے میں علمائے دیوبند سے رجوع کیا گیا تو انہوں نے فقہ حنفی کے مطابق اس مغلظ ہی قرار دیا اور لکھا: "تین طلاق اس صورت میں واقع ہو گئیں، سوائے حلالہ کے کوئی تدبیر اس کی نہیں، فقط واللہ اعلم، بندہ رشید احمد عفی عنہ گنگوہی۔" یہی بات مفتی دیوبند اور مفتی کفایت اللہ مرحوم نے اپنے فتاوی میں لکھی،(۱۶)

لیکن جب مولانا عبدالحیٰ لکھنوی مرحوم سے پوچھا گیا تو انہوں نے لکھا: "اس صورت میں حنفیہ کے نزدیک تین طلاق واقع ہوں گی اور بغیر تحلیل کے نکاح درست نہ ہوگا' اگر بوقت ضرورت اس عورت کا علیحدہ ہونا اس سے دشوار ہو اور مفاسد زائدہ کا خطرہ ہو' (ایسی صورت میں) تقلید کسی اور امام کی اگر کرے گا تو کچھ مضائقہ نہیں' نظیر اس کی مسئلہ نکاح زوجتہ مفقود (الزواج) میں موجود ہے کہ حنفیہ عندالضرورت قول امام مالک پر عمل کرنے کو درست رکھتے ہیں۔"(۱۷)

مولانا موصوف نے اس مسئلہ کے علاوہ بعض دوسرے مسائل میں بھی دوسرے ائمہ کرام اور علماء کے اقوال کو نقل کر کے آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس قسم کی کوشش ہمیں علمائے دیوبند کے فتاوی میں نظر نہیں آتی حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ متاخرین علمائے احناف نے کئی امور میں دوسرے ائمہ کرام کے اقوال کو اختیار کرنا روا رکھا ہے' ایسے ہی خود علمائے دیوبند بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ "اگر مختلف اقوال یا غیر مفتی بہ اقوال سے کلیتہ" قطع نظر کر لی جائے تو پھر ان توسعات سے استفادہ کا دروازہ اگر بند نہیں تو تنگ ضرور ہو جائے گا' جس کا اس زمانہ میں کشادہ رہنا ضروری ہے۔"(۱۸) چنانچہ اگر علمائے دیوبند اپنے فتاوی میں "ان مختلف اقوال یا غیر مفتی بہ اقوال اور توسعات" سے استفادہ کرتے تو برطانوی ہندوستان میں مسلم خواتین بڑی آزمائشوں اور فتنوں سے بچ سکتی تھیں۔ اس بات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے کہ ہمارے اجتماعی مسائل کی یہی سنگینی تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو ۱۹۲۰ء میں فسخ نکاح کے لیے مسلم قاضی کا ہونا ضروری گردانتے تھے' ۱۹۵۰ء کی دہائی میں فسخ نکاح سے متعلق غیر مسلم عدالت کے فیصلہ کو جائز قرار دیا تھا۔(۱۹) علمائے دیوبند کے فتاوی میں یہ توسع اور یہ آسانی نظر نہیں آتی' اس کی وجہ وہی

ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے' اگر وہ تقلید میں شدت کی بجائے شاہ ولی اللہ کا فقہی موقف اختیار کرتے' اپنی علمی سرگرمیوں میں فقہ حنفی کے ساتھ ساتھ دوسرے فقہی مذاہب اور اہل علم مثلاً ابن تیمیہ' ابن قیم اور ابن حزم کے افکار سے بھی استفادہ کرتے' روح عصر کو اپنی فقہی تعلیم میں جذب کرتے' اور معاشرہ کے مظلوم طبقہ کی تلخ زندگیوں سے آگاہ ہوتے' تو ان کے تفقہ و تدبر کا افق یقیناً وسیع ہوتا اور ادراک حقیقت کے لیے ان کی فکری جدوجہد کے قدم بے شبہ نئی نئی راہوں سے آشنا ہوتے' البتہ اس امر سے انکار نہیں کہ علمائے دیوبند کے فتاوی پر جب کبھی متانت اور سنجیدگی سے تنقید کی گئی تو انہوں نے اپنے فیصلوں پر نظرثانی کرنے سے گریز نہیں کیا اور تلاش حق کو اپنی منزل قرار دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتداء میں لاؤڈ سپیکر کے استعمال کو یا ڈاک خانہ سے روپوں کے بھجوانے اور ان پر فیس کی ادائیگی کو ناجائز کہا گیا' لیکن جب انہیں صحیح صورت حال سے آگاہ کیا گیا' تو انہوں نے اپنے موقف سے رجوع کیا۔(۲۰) ایسے ہی جب برصغیر میں جاگیرداری نظام کے خلاف اٹھنے والی آوازوں میں شدت آئی اور معاشرے میں بندۂ مزدور کے تلخ اوقات نے سرمایہ داروں کے خلاف آگ لگائی' تو علمائے دیوبند نے ان آوازوں پر کان دھرا اور مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی تحریروں میں (اسلام کا اقتصادی نظام اور اسلام اور نظام جاگیرداری بالترتیب) کھل کر لکھا کہ اسلام کو جاگیرداری یا سرمایہ داری نظام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مولانا گیلانی نے مزید لکھا کہ ایران اور روما کے خلاف مسلمانوں کا اعلان جنگ دراصل اسی جاگیرداری نظام کو ختم کرنا تھا۔ انہوں نے صحیحین کی روایات اور اہل علم کے آثار سے جن میں حضرت امام اعظم (رحمتہ اللہ علیہ) سرفہرست ہیں' ثابت کیا کہ زمین کو ٹھیکہ یا بٹائی پر دینا شرعاً" جائز نہیں۔ بے شبہ یہ دونوں

علماء ماہر اقتصادیات یا معاشیات نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے اس کا دعویٰ کیا تھا، لیکن انہوں نے جاگیرداری اور زمینداری کے بارے میں اسلام کے صحیح موقف کو بیان کر کے مذہب کے خلاف پھیلائے جانے والے پروپیگنڈے کو بے بنیاد قرار دیا۔ اس طریق سے مذہب کی مثبت خدمت سرانجام دی اور مظلوم طبقوں کی صفت میں کھڑے ہو کر ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔(۲۱)

القصہ مدرسہ دینی امور میں فقہ حنفی کی روشنی میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتا رہا اور اپنے فقہی مسلک پر شدت سے عامل رہا۔ مدرسہ شرعی احکام کی تعلیم و تبلیغ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی روحانی تربیت کا انتظام بھی کرتا رہا، بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ اس نے مذہبی تعلیم کا بنیادی مقصد ہی روحانی تربیت اور تزکیہ نفس قرار دیا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مدرسہ کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب نانوتوی سے لے کر مولانا سید حسین احمد مدنی تک نے تصوف اور تزکیہ نفس کے بارے میں جو مکاتیب لکھے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نفس کی بیماریوں پر قابو پانے کے لیے کہ زندگی کا مشکل ترین کام ہے، ان حضرات نے کیا کیا روحانی ریاضتیں کی ہیں۔(۲۲) واقعہ یہ ہے کہ مدرسہ نے ایک ہی وقت میں اپنے سٹیج پر اسلامی علم و ادب کے نمائندوں کو بٹھانے کا جو اہتمام کیا ہے، اس کا سہرا اسی روحانی تربیت کے سر ہے، جو تصوف کی شکل میں علمائے دیوبند کے رگ و پے میں دوڑتا پھرتا ہے۔ چنانچہ مدرسہ نے اسلام کے کسی ایک گروہ پر ہی نہیں، بلکہ سب گروہوں پر مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، صوفی۔ اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کئے ہیں۔ جس کی وجہ سے مدرسہ کا مجموعی فکر ان اثرات سے کسی حد تک محفوظ رہا ہے، جو کسی ایک گروہ کا امتیازی نشان بن گئے ہیں، مثلاً کہا جاتا ہے کہ علم کلام میں اشعریت مسلمانوں کی روحانی اور فکری زندگی میں جمود کا باعث بنی ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمان کی رائے ہے کہ "عہد حاضر کے

مسلمان مفکرین کی اکثریت نے تیرھویں صدی کے وسط میں خلافت کی تباہی اور مسلم دنیا کے سیاسی انتشار کو مسلمانوں کے فکری جمود کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے' لیکن جیسا کہ ہم نے اپنے تجزیہ میں کہا ہے کہ اس (سیاسی) بربادی سے بہت پہلے اسلامی روح میں جمود آ چکا تھا' صحیح بات تو یہ ہے کہ جن اصولوں پر اسلامی قانون کی بنیادیں استوار کی گئی ہیں' ان میں جمود تھا۔ علم کلام اور اس کے ارتقاء نے اس خصوصیت کا (جمود) مظاہرہ کیا ہے' بلکہ قانونی سوچ سے بھی بڑھ کر' علم کلام کی' جس نے کہ دسویں' گیارھویں اور بارھویں صدی میں تشکیل پائی' سب سے زور دار شکل نے اشعریت کے روپ میں جنم لیا۔ اس نے اپنے لیے اس عظیم مقام: "اسلامی قانون کے اصولوں کا دفاع کرنے والا' کا دعویٰ کیا۔ اشعریت نے نظریہ اسباب و علل اور انسانی ارادہ کی تاثیر کے خیال کو مسترد کر دیا جس سے مقصد (بزعم خویش) خدا کی قدرت کاملہ کا اثبات تھا (یعنی دنیا کے سٹیج پر انسان نہیں' بلکہ صرف اللہ ہی کی ذات اپنا کردار ادا کر رہی ہے) اشعریت نے مزید کہا کہ حسن و قبح کے جاننے کا پیمانہ عقل نہیں' وحی ہے۔ نیز یہ کہ قرآنی احکام واوامر کے پیچھے کوئی فلسفہ یا مقصد نہیں ہے۔ ان کی صرف اس لیے پیروی کی جاتی ہے کہ وہ بس خدائی اوامر ہیں' اشعری نظریہ کو پروان چڑھانے والے دسویں صدی کے عالم باقلانی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مسلمانوں سے زمان اور مکان کی جوہریت پر (ATOMISM) اعتقاد رکھنے کا (یعنی نظریہ اسباب و علل کو مسترد کر دینا) سرکاری سطح پر مطالبہ کیا جائے۔ فکر و نظر کی یہ تبدیلی خلافت کی بربادی سے بہت پہلے وجود میں آ چکی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اکثریت نے آہستہ آہستہ مسلم دنیا پر اپنی گرفت مضبوط کی اور غزالی جیسے صوفی کی امداد سے جو بڑی موثر ہوئی۔ اس کا دائرہ وسیع ہوا حتیٰ کہ سنی مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے اسے عقیدہ کے طور پر قبول کر لیا۔" (۲۳)

تقلید میں علماء کی شدت کا باعث دراصل یہی اشعریت ہے' جس نے بالاخر غور و فکر کے سارے سوتوں کو خشک کر دیا ہے۔ اشعریت کے اس جمود و تعطل کو علمائے دیوبند نے تصوف کے سوزدروں سے دور کرنے کی کوشش کی' تصوف کی راہ پر چل کر انہوں نے اپنی انفرادی زندگیوں کو اخلاقی فضائل سے آراستہ کیا اور فکر و نظر کی ہر پستی سے پیچھا چھڑانے کی سعی پیہم کی' ان روحانی ریاضتوں اور مراقبوں میں علمائے دیوبند نے اجتماعی تقاضوں سے بھی تغافل نہیں برتا' انہوں نے مذہب کی بلند قدروں: حریت' مساوات' صداقت' عدالت سے سرشار ہو کر غیر ملکی ظالمانہ اقتدار کے خلاف بھرپور جدوجہد کی اور اس راہ میں آنے والی مشکلات کا صبر' عزم اور استقامت سے مقابلہ کیا۔ مولانا محمود حسن دیوبندی' مولانا کفایت اللہ دہلوی اور مولانا سید حسین احمد مدنی کی متحرک' باوقار اور سپاہیانہ زندگیوں نے تصوف کے خلاف وہم و گمان کے سارے اندیشوں کو یک قلم بے بنیاد قرار دیا کہ وہ (تصوف) زندگی سے فرار کا نام ہے یا وہ صرف شخصی نجات (Personal Salvation) کا درس دیتا ہے۔ تصوف میں ایک بلند مقام "اہل فتوت" کا ہے' جہاں پر پہنچ کر آدمی بہ قول امام قشیری' مخلوق خدا کی خدمت میں سرگرم عمل رہتا ہے' دوستوں کی لغزشوں پر پردہ ڈالتا ہے' اپنے آپ کو دوسروں سے فروتر سمجھتا ہے اور خدا کے ماسوا ہر بت کو توڑ دیتا ہے۔ یہ کہنا یقیناً عین انصاف ہو گا کہ علمائے دیوبند کی ممتاز ہستیاں۔ حاجی سید محمد عابد' محمد قاسم نانوتوی' محمد یعقوب نانوتوی' پہلے دن ہی سے اس بادۂ "فتوت" سے مست تھیں۔ (۲۴) بیسویں صدی میں تو یہ سرمستیاں اور ہی رنگ لائیں جب "اصحاب عقل" نے دیکھا کہ اہل جنوں کا یہ قافلہ مولانا محمود حسن دیوبندی کی قیادت میں دیوبند کی خانقاہ سے نکل کر برطانوی استعمار کو دعوت مبارزت دے کر لال قلعہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس قافلے کے آخری آدمی

شاید مولانا سید حسین احمد مدنی (وفات ۱۹۵۷ء) تھے جو برطانوی ہندوستان میں اپنے شیخ (مولانا محمود حسن) کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حصول آزادی کے لیے سرگرم عمل رہے اور جب آزادی کے بعد برصغیر ہولناک فسادات کی آگ میں جل رہا تھا' تو آپ نے امن پسند طاقتوں کے ساتھ مل کر ہندوستانی مسلمانوں کو بچانے کے لیے بے پناہ کام کیا۔ ان کا یہ کارنامہ دراصل ان روحانی اور اخلاقی قدروں کی فتح تھا' جن کی تربیت انہوں نے مدرسہ دیوبند کی چٹائیوں پر بیٹھ کر حاصل کی تھی۔

یہی وہ روحانی تربیت ہے' جس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد طیبؒ (سابق ناظم مدرسہ) فرماتے ہیں: "دارالعلوم کے اس مسلک کا دوسرا بنیادی عنصر اخلاق اور تزکیہ نفس ہے جو ریاضات و مجاہدات اور سلاسل تصوف سے وجود پذیر ہوتا ہے' اس مسلک کے تحت جماعت دیوبند کے اکابر اکثر و بیشتر سلسلہ چشتیہ سے اور بہت سے نقش بندیہ سے وابستہ ہیں۔"(۲۵) یہ تزکیہ نفس جہاں علمائے دیوبند کے علمی مزاج کو اشعریت کے جبر سے محفوظ رکھتا ہے' وہاں وہ کتاب و سنت کے صحیح مفہوم و مراد کو پانے میں بھی ان کی مدد کرتا ہے' اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے مولانا محمد طیبؒ فرماتے ہیں: "کتاب و سنت کے مرادات' اقوال سلف اور ان کے متوارث مذاق کی حدود میں رہ کر محض قوت مطالعہ سے نہیں' بلکہ اساتذہ و شیوخ کی صحبت و ملازمت اور تعلیم و تربیت ہی سے ہو سکتا ہے' اس کے ساتھ ساتھ عقل و درایت اور تفقہ فی الدین بھی جز ہے۔"(۲۶) مدرسہ دیوبند کا یہی فکری توازن ہے کہ "دینی شعبوں کے تمام ارباب فضل و کمال اور راسخین فی العلم خواہ محدثین ہوں یا فقہاء صوفیا ہوں یا عرفاء' متکلمین ہوں یا اصولیین' امراء اسلام ہوں یا قضاء اس (مدرسہ) کے نزدیک سب واجب الاحترام اور واجب العقیدت ہیں۔"(۲۶A) کتاب و سنت کے

حقائق و معانی کے ادراک کے لیے روایت و تقلید اور عقل و درایت اور تزکیہ نفس کی راہ پر چلنے کا یہ نتیجہ ہے کہ ارباب دیوبند نے مسلم معاشرے میں کام کرنے والے ہر صاحب اخلاص کو خواہ اس کے مذہبی افکار سے مدرسہ کو اختلاف ہی کیوں نہ ہو' عزت کی نگاہ سے دیکھا اور اس سے کبھی آویزش نہیں کی' مدرسہ کا یہی فکری اعتدال ہے' جس نے مدرسہ کو مسلم معاشرے کے بنیادی دھارے سے کٹنے نہیں دیا۔

۳:۔ مدرسہ دیوبند کا تیسرا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ دینی تعلیم کا بنیادی مقصد طے کرنے کے بعد اپنی راہ پر چلتا رہا اور ملک کے نئے سیاسی نظام سے اس کی سوچ مرعوب نہیں ہوئی اور یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو گا کہ مدرسہ کے معاصر علمی ادارے نئی سیاسی طاقت کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے' مثلاً" ہم دیکھتے ہیں کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خان مرحوم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: "پس اصلی تعلیم کا یہ کام ہے کہ ہمارے طالب علموں کی حقیقت بیں طبیعتوں کو قوم انگلشیہ کے عالی صفات کے مطالعہ کرنے کا موقعہ دے۔ اس وقت ان کو معلوم ہو جائے گا کہ تقریباً" ہر ایک انگریز کے عمل اور فعل میں برک اور میکالے کم و بیش موجود ہیں' ضرورت اس کی ہے کہ انگریزوں کے متعلق صحیح حالات ہمارے نوعمروں کو معلوم ہوں' یہی وہ اصول ہے جو ابتداء سے علی گڑھ کالج کی تعلیم میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ انگلش اخلاق کے اعلیٰ نمونے شروع سے طلبہ کے پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ ناواقف اصحاب اس اصول کو بعض وقت گورنمنٹ کی خوشامد اور لجاجت پر محمول کرتے ہیں' حالانکہ یہ نہیں سمجھتے کہ دل و دماغ سے غلامی کی سیاہی اور زنگ کو مٹانے کے لیے انگلش اخلاق کے تیزاب سے بڑھ کر اور کوئی مصالحہ نہیں ہے اور جب کہ طلبہ کے دل و دماغ

سے ابتداء عمر سے غلامی کی بو رفع ہو گی تو پھر خوشامد اور لجاجت کیسی؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ حقیقی تعلیم و تربیت کا اول نتیجہ روشن ضمیری اور فراخ دلی ہونا چاہیے اور اس کا اول تقاضا یہ ہے کہ جس میں جو فضیلت اور برتری ہو وہ صاف معلوم ہو جائے اور فیاضی کے ساتھ اس کا اعتراف ہو۔"(۲۷)

برطانوی ہندوستان میں جدید تعلیم کی اہمیت اور اس کے حصول کا مسئلہ کبھی بھی سنجیدہ اہل علم کے ہاں محل نزاع نہیں رہا۔ ایسے ہی علی گڑھ نے مسلم معاشرے کو بیدار کرنے اور اسے روح عصر کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے جو کردار ادا کیا ہے وہ بھی ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہے' لیکن انگریزی معاشرت اور آداب کو طرز زندگی بنانا دوسرا مسئلہ تھا' جس پر روایت پسند دانش مند اپنی رائے رکھتے تھے۔ وہ مرحوم آفتاب احمد کی اس رائے سے اختلاف رکھتے تھے کہ انگلستان کی سرزمین "صدیوں سے معتدل اور منضبط آزادی کی آب و ہوا میں اخلاقی اور دماغی جوہروں کے اعلیٰ نمونے دنیا کے سامنے پیش کر رہی تھی۔" بے شبہ برک' مورلے اور اس پایہ کے دوسرے اہل فکر کی تحریروں سے برصغیر کے دانشوروں کو ایک نئی زندگی ملی تھی' لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو تقریباً ڈیڑھ سو سال تک اہل ہند کو سیاسی اور اقتصادی طور پر پامال کرتی رہی' یقیناً "اخلاقی اور دماغی جوہروں کے اعلیٰ نمونے" دنیا یا اہل ہند کے سامنے پیش نہیں کئے' یہی وجہ ہے کہ مدرسہ دیوبند نے اپنے طالب علموں کے سامنے "انگلش اخلاق کے اعلیٰ نمونے" نہیں رکھے' اس کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ان کی کھوئی ہوئی منزل کا پتہ بتایا جائے۔

مدرسہ دیوبند کا ایک دوسرا معاصر ندوۃ العلماء لکھنؤ تھا' جس کے اصلاحی پروگرام سے مدرسہ دیوبند کے روحانی رہنما حاجی امداد اللہ صاحب بھی خوش تھے' ندوہ نے اپنے اجلاس کان پور میں جو ۱۲ محرم ۱۳۱۳ھ کو حاجی محمد

کفایت اللہ کے مکان پر منعقد ہوا' دارالعلوم کے قیام کے لیے ایک دستور پر غور و فکر کیا' اس میں کہا گیا تھا:

ا۔ "تمام طالب علموں کا ایک اسلامی لباس ہو گا اور وہ خاص شرفائے عرب کے طور پر ہو گا۔"

ا۔ تمام طلبہ عرب کے طریقہ پر کھانا کھائیں گے۔"(۲۸)

یوں نظر آتا ہے کہ ندوۃ العلماء نے علی گڑھ کالج کے جواب میں "شرفائے عرب" کے اسلامی لباس کو اپنے طالب علموں کے لیے پسند کیا۔ "شرفائے عرب" کے لباس کی قدر و قیمت کا یہ حال تھا کہ مولانا شبلی مرحوم نے اپنے قیام استنبول میں ایک دن اپنے ایک عرب دوست کے ہمراہ ترک وزارت دفاع کے سیکرٹری سے ملاقات کی' مولانا "عرب اشراف" کا لباس پہنے ہوئے تھے' سیکرٹری موصوف نے مولانا کو عرب گداگر تصور کرتے ہوئے چند عثمانی ٹکے مولانا کی نذر کرنے چاہے' مولانا نے فرط حیرت سے پوچھا یہ کیا ہے؟ ہم بھیک مانگنے والے فقراء نہیں ہیں؟ سیکرٹری موصوف کو مولانا کے عرب ساتھی نے صحیح صورت حال سے آگاہ کیا' تو اسے ندامت ہوئی' لیکن مولانا کو بہت جلد پتہ چلا گیا کہ یہاں استنبول میں "عرب اشراف کا اسلامی لباس" کس نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ علی گڑھ اور ندوۃ العلماء کے تعلیمی منشور کے برعکس ارباب دیوبند نظریہ اشراف سے خواہ وہ مشرقی ہو یا غربی' متاثر نہیں ہوئے' انہوں نے اپنی سادہ معاشرت کو ترک کرنا گوارا نہیں کیا' صحیح بات تو یہ ہے کہ ان کا تعلق "قبیلہ اشراف" سے نہیں بلکہ عامتہ الناس سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غریبوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو سننے میں ان کے کان حساس واقع ہوئے ہیں۔ بے شبہ ان کے ہاں مذہبی تعلیم کا مقصد رضائے الہی تھا' لیکن وہ معاشی زندگی کی اہمیت سے کبھی غافل نہیں رہے' چنانچہ انہوں نے مدرسہ میں شعبہ طب قائم کیا جس کا

چار سالہ نصاب ہے۔ یہ شعبہ اس لیے قائم کیا گیا کہ طالب علم مدرسہ کی بنیادی تعلیم سے فارغ ہو کر طب کو ذریعہ معاش بنائیں اور پورے سکون و وقار سے اسلامی تبلیغ کا کام انجام دیں' مدرسہ نے اسی غرض یعنی معاشی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ۱۹۴۹ء میں طالب علموں کے لیے جلد سازی اور ہلکی پھلکی صنعت کا شعبہ بھی قائم کیا۔ ایسے ہی مدرسہ نے طلبہ کے لیے خطاطی کا انتظام بھی کیا۔ ان سب شعبوں کے قیام کا مقصد طالب علموں کو معاشی مشکلات سے نجات دلانا تھا۔ ان شعبوں نے کہاں تک ترقی کی اور کس حد تک طالب علموں کو معاشی دباؤ سے آزاد کرایا؟ ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے' مدرسہ سے شائع ہونے والی رپورٹوں سے ہمیں کوئی زیادہ معلومات نہیں ملیں۔ ان شعبوں کا قیام خواہ کسی پیمانے پر ہو' اپنی ذات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے علمائے دیوبند کی سوچ کا پتہ چلتا ہے' وہ اپنی منزل اور مشکلات راہ سے آگاہ تھے' انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ حکومت کی ملازمت ایک معقول اور باوقار ذریعہ معاش تصور کی جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے انگریزی ملازمت کو رخصت تصور کیا اور اسے مقام عزیمت سے فروتر ہی گردانا' چنانچہ جہاں انہوں نے اپنے طالب علموں کو طب' خطاطی اور جلد سازی کی صنعت سیکھنے کا مشورہ دیا' وہاں انہیں اپنے عمل سے یہ درس بھی دیا کہ ارباب ہمت نے معاش کی آزاد راہیں خود ہی تلاش کی ہیں۔

القصہ قیام مدرسہ کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں شہرت اور قبولیت عامہ نے آگے بڑھ کر مدرسہ کے قدم لیے' جس پر شاید اہل مدرسہ کو بھی حیرت ہوئی' مذہبی حلقوں میں اس کی اس غیر معمولی پذیرائی کی وجوہ وہی تھیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا' مدرسہ اپنے پاس ایک ٹھوس پروگرام رکھتا تھا' وہ اپنے مقصد کے بارے میں ایک صاف اور واضح ذہن رکھتا تھا' جس میں کسی قسم کا کوئی

ابہام یا الجھاؤ نہیں تھا۔ ایسے ہی اس نے اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے جو راہ اختیار کی وہ بھی صاف اور سیدھی راہ تھی' چنانچہ ایک طرف اس نے عمدہ بنیادوں پر نظم و نسق قائم کیا اور بڑی سختی سے قواعد و ضوابط کی پیروی کی' دوسری طرف اس نے درس و تدریس اور تربیت و تزکیہ کے حلقے قائم کئے' جس میں ارباب مدرسہ کے اخلاص و ایثار اور زہد و تقویٰ نے بنیادی کردار ادا کیا۔ مدرسہ کے پہلے فارغ التحصیل طالب علم عموماً" نہ صرف مذہب کا کتابی علم رکھتے تھے' بلکہ مذہب کی روح میں اترنے کا ذاتی تجربہ بھی' دراصل اسی بات میں ان کی کامیابی کا راز مضمر تھا۔ کیوں کہ مذہب چند بوجھل عقائد یا چند کتابوں کے رٹنے رٹانے کا نام نہیں ہے' یہ تو ایک قلبی یا معنوی تجربے کا نام ہے جو زندگی کے بارے میں انسان کے نقطہ نظر کو یک قلم بدل دیتا ہے' یہ قلبی کیفیت ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ہم علم کلام کا تو انکار کر سکتے ہیں' لیکن زندگی کے حقائق کا انکار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مدرسہ کا منتہائے نظر مذہب کا کتابی علم نہیں' عرفان ذات ہے۔ وہ اپنے طالب علموں کو اس مقام پر دیکھنا چاہتا ہے جہاں پر وہ "گویا خدا کو دیکھ رہے ہیں۔" اگر انہیں یہ مقام میسر نہیں آتا تو انہیں کم از کم یہ شعور ضرور ہونا چاہیے کہ "خدا کی نگاہ انہیں دیکھ رہی ہے۔" مدرسہ کی یہی کرامت تھی جس نے مدرسہ کو مقبول عوام بنایا۔

مدرسہ نے درس و تدریس اور تربیت و تزکیہ کے علاوہ سماجی اصلاح کا بھی بیڑا اٹھایا۔ مدرسہ نے ان رسموں کے خلاف آواز اٹھائی' جنھوں نے مسلمانوں کی سماجی اور معاشی زندگی کو تاراج کر رکھا تھا مثلاً" بیوہ عورتوں کی دوسری شادی کو عیب اور ننگ تصور کرنا یا عقیقہ' شادی اور ولیمہ کی تقریبات پر سادگی کی بجائے اسراف اور فضول خرچی سے کام لینا' خواہ اس کے لیے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے' لیکن خاندان اور معاشرے میں جھوٹی بڑائی کا "بھرم"

قائم رہے' گزشتہ صدی میں بیوہ خاتون کا دوسری شادی کرنا---- ایک پاپ اور ننگ تصور کیا جاتا تھا۔ شرفاء کے خاندان اسے اپنے لیے رسوائی کا باعث سمجھتے تھے۔ جب ایک رسم معاشرے میں اپنے قدم جالیتی ہے' تو پھر اس کے خلاف آواز اٹھانا سب سے بڑا جرم شمار کیا جاتا ہے' چنانچہ بعض نیک بندوں کو مسجد سے اس لیے نکلنا پڑا کہ انہوں نے اپنے وعظ میں بیوگان کے نکاح کا ذکر کر دیا تھا' لیکن ان رسموں کی قہرمانی اہل حق کو حق گوئی سے نہ روک سکی' مولانا مملوک علی اور مولانا مظفر کاندھلوی نے بڑی ہمت اور بہادری سے نکاح بیوگاں کا کام شروع کیا۔ ان کے بعد مولانا نانوتوی نے اس مشن کو جاری رکھا اور اپنے مشن کو موثر بنانے کے لیے اپنی بیوہ بہن کا عقد ثانی کر دیا۔ مولانا کی اصلاحی کوششوں سے دیوبند اور اس کے گرد و پیش میں یہ بری رسم (بیوہ کا نکاح نہ کرنا) ختم ہوئی' ایسے ہی مولانا نے اپنے عقیدت مندوں اور ملنے والوں کو ان بستیوں میں زمین خریدنے سے روکا جہاں پر بیٹیوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اس سے علاقہ کے لوگوں میں ایک صحت مند مذہبی شعور پیدا ہوا۔ مولانا کے بعد ان کے جان نشینوں نے سماجی اصلاح کا کام برابر جاری رکھا' مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ''اصلاح الرسوم'' کے نام سے کتاب بھی لکھی جسے ان کے حلقے نے وسیع پیمانے پر پھیلایا' مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا محمد زکریا سہارنپوری نے نہ صرف سادگی سے اپنی بیٹیوں کی شادیاں کیں' بلکہ ان شادیوں میں شریک ہونے سے اجتناب کیا جو نام و نمود کے اظہار کا نشان بن گئی تھیں' مولانا مدنی ان تقریبات میں بھی نہیں جاتے تھے جہاں پر بیوی کا مہر فاطمی مہر نہیں ہوتا تھا۔ مولانا کے اس طرز عمل سے بہت سے لوگوں نے تقریبات کو سادگی سے منایا تاکہ مولانا کی شرکت کی سعادت اور ان کی دعاؤں سے محروم نہ رہیں۔

مولانا محمد قاسم (وفات ۱۸۸۰ء)

علمائے دیوبند نے مذہبی افکار کی نشرواشاعت کے لیے تصنیف و تالیف کو بھی اختیار کیا' ہر چند مولانا نانوتوی اور ان کے پہلے شاگردوں کی تحریریں' وقت کے عام مذہبی رجحانات اور ان کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں' لیکن رفتہ رفتہ ان کی تحریریں مناظرہ و مجادلہ کے اثرات سے پاک ہوتی گئیں' معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں مذہبی مناظروں کا اس قدر زور تھا کہ ان سے دامن بچانا ممکن نہ تھا۔ علمائے دیوبند اس میدان میں مجبوراً" اترے جس کی وجہ سے مولانا نانوتوی کی تالیفات میں مناظرے کا رنگ غالب ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ مولانا کو وہ دل جمعی اور سکون میسر نہ آیا جو فکری زندگی کے لیے ضروری ہے۔ مدرسہ کی سرپرستی' درس و تدریس کی گہماگہمی' عقیدت مندوں کے خطوط کے جو مذہبی سوالات پر مشتمل ہوتے تھے' جوابات' مختلف مذاہب کے باہمی مناظروں میں "شرکت" غرضیکہ ان تمام باتوں نے مولانا کو چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ مزید یہ کہ مولانا بہت جلد اس جہان رنگ و بو سے اکتا گئے۔ ابھی زندگی کے پچاس برس بھی پورے نہیں کئے تھے کہ موت کا پیغام آگیا' ان امور کے باوجود ان کی تالیفات میں ان کی فطری ذہانت نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ انہیں دو دفعہ شاہ جہاں پور کی ایک بستی چاندپور میں "میلہ خدا شناسی" (۱۸۷۵ء' ۱۸۷۶ء) میں جانا پڑا' جس کا انتظام بستی کے ایک ہندو رئیس منشی پیارے لال نے کیا تھا۔ منشی صاحب نے ایک مذہبی مذاکرے کے لیے ہندو مت' عیسائیت اور اسلام کے نمائندوں کو دعوت دی اور اس مذاکرے کا نام "میلہ خدا شناسی" رکھا گیا۔ اس میلے کا انعقاد ۷ مئی ۱۸۷۵ء کو عمل میں آیا۔ جس میں منشی صاحب موصوف کی طرف سے مندرجہ ذیل سوالات رکھے گئے:

۱۔ دنیا کو خدا نے کسی چیز سے بنایا اور کس وقت اور کس واسطے؟
۲۔ خدا کی ذات محیط کل ہے یا نہیں؟
۳۔ خدا عادل اور رحیم ہے' کیسے؟
۴۔ وید' بائبل اور قرآن کے کلام الٰہی پر کیا دلیل ہے؟
۵۔ نجات کیا چیز ہے اور کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے؟

اس میلے میں عیسائیوں کی طرف سے چاندا پور میں مشن سکول کے انچارج پادری نولس شریک ہوئے' جو منشی پیارے لال کے دوست تھے' دوسرے سال ۱۸۷۶ء میں "میلہ خدا شناسی" میں پنڈت دیانند سرسوتی بھی شریک ہوئے۔ میلے کے نظم و نسق کے لیے پولیس' کلکٹر' مجسٹریٹ بھی موجود تھے۔ میلے کی رپورٹ سے جو "مباحثہ شاہ جہاں پور" کے نام سے میرٹھ مطبع ضیائی کے مالکان محمد ہاشم علی' محمد حیات اور مولانا فخر الحسن گنگوہی نے مرتب کی' پتہ چلتا ہے کہ اس میلے کا مقصد تلاش حق نہیں تھا۔ کچھ اور تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ منشی پیارے لال نے پادری نولس اور پنڈت سرسوتی سے مل کر میلے کی تفصیلات (موضوع' وقت کی تحدید' سوالات کی ترتیب) پہلے ہی طے کر لی تھیں جس سے مولانا نانوتوی اور مسلم وفد خوش نہیں تھا۔ حتیٰ کہ مجلس انتظامیہ کے ایک ممبر موتی میاں کو جو چاندا پور کے ایک مسلم رئیس تھے' کہنا پڑا: "یہ بات بالکل ساز اور اتفاق باہمی (ہندوؤں اور عیسائیوں) پر دلالت کرتی ہے۔" اس سے پتہ چلتا ہے کہ میلے کا مقصد مسلمانوں کو کھلے اجلاس میں نیچا دکھانا تھا' بہرحال مولانا نے اس میلے میں تقریر فرمائی اور بتایا کہ صرف خدا ہی کی ذات ہے جو عبادت کی مستحق ہے۔ ایسے ہی رسول اکرمؐ جو نہ صرف تمام پیغمبروں سے افضل ہیں بلکہ سلسلہ نبوت کی آخری کڑی بھی ہیں۔ مولانا نے عیسائیت اور ہندو مت کے بعض افکار پر تنقید بھی کی' لیکن ویدوں او ہندوؤں کے مقدس مذہبی

رہنماؤں کو برا بھلا کہنے سے اجتناب کیا۔ مولانا کی تقریر سے سننے والوں پر، خاص طور پر مسلمانوں پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی اور یوں مسلمانوں کو برسرعام رسوا کرنے کی سازش ناکام ہو گئی۔

۱۸۷۸ء میں مولانا کو ایک دوسرے مناظرے کے سلسلے میں رڑکی جانا پڑا۔ ہوا یوں کہ پنڈت دیانند سرسوتی نے رڑکی میں ایک کھلے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کو بت پرست قرار دیا اور کہا کہ مسلمان دوسروں کو تو بت پرست کہتے ہیں، لیکن خود اپنی خبر نہیں لیتے، کعبہ کی پوجا کرتے ہیں، جو پتھروں کی ایک عمارت ہے، مولانا کو اطلاع ہوئی تو آپ ناسازی طبع کے باوجود رڑکی پہنچے اور پنڈت جی کو کھلے اجلاس میں مذاکرہ کی دعوت دی، لیکن پنڈت جی تیار نہ ہوئے۔ مولانا نے ہر ممکن طریق سے پنڈت جی کو بات چیت کرنے کے لیے تیار کرنا چاہا، لیکن پنڈت جی نے ایک نہ سنی اور رڑکی سے چلے گئے۔ مولانا نے پنڈت جی کے اعتراضات کا جواب برسرعام دیا اور پھر اسے قبلہ نما کے نام سے کتابی صورت میں جمع کر دیا۔ یہ کتاب اب دوبارہ ۱۹۶۰ء میں دارالعلوم دیوبند ہی سے شائع ہوئی ہے، جس پر تشریحی نوٹ مولانا اشتیاق احمد صاحب نے لکھے ہیں، لیکن ہمیں لکھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ مولانا اشتیاق احمد نے بعض مقامات پر اپنے تشریحی نوٹوں میں دقت نظر سے کام نہیں لیا مثلاً" مولانا نانوتوی نے اپنی تقریر میں ایک جگہ ویدوں اور اچاریہ شنکر کے بارے میں کہا: "ہاں! جب یہ لحاظ کیا جائے کہ باتفاق ہنود بید اور اپنکھد (بید کو وید اور اپنکھد کو اپنشد بھی کہتے ہیں) سب کتابوں کی نسبت پرانی ہیں اور اپنکھدوں میں شنکر اچارج (اس کو اچاریہ بھی کہتے ہیں) کا قصہ اور ان کا تفسیر کرنا اقوال وید میں مذکور ہے اور شنکر اچارج کو کل پانسو چھ سو برس گزرے ہیں، تو یقین ہو جاتا ہے مہابھارت میں جس انشقاق (قمر) کا ذکر ہے۔ وہ اور انشقاق ہے، یہ انشقاق

نہیں جو زمانہ محمدیؐ میں واقع ہوا' کیونکہ اس صورت میں بید اور اپنکھدوں کی عمر بھی پانسو چھ سو سال سے کم ہی ہو گی۔" (ص ۸۴) مولانا نانوتوی کے اس بیان پر شرح نویس لکھتے ہیں: "بید اور اپنکھدوں کے بارے میں جو کچھ حضرت شمس الاسلامؒ (مولانا محمد قاسم) نے قیاس کیا ہے' اس کی تائید شیخ سعدی علیہ الرحمتہ کے ایک مقالہ سے بھی ہوتی ہے جو اپنی منظوم کتاب : بوستاں میں انہوں نے تحریر فرمایا ہے.........(سعدی) فرماتے ہیں۔

مہیں برہمن راستورم بلند — کہ اے پیر تفسیر استاد ژند

بتقلید کافر شدم روز چند — برہمن شدم در مقالات ژند

اس شعر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کتب وید درحقیقت مقالات ژند کا ترجمہ ہیں یا ان سے ماخوذ ہیں'... اس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ ۶۵۶ھ میں یہاں کے برہمنی مذہب کی اصل کتاب "استاد اور ژند" تھی' یہ بات قرین قیاس ہے کہ مذکورہ بالا سن ہجری کے بعد اس کو ماخذ بنا کر اس کے کل یا بعض مقالات کو سنسکرت میں منتقل کر کے وید بنائے گئے۔" (ص ۸۴' ۸۵ حاشیہ) مولانا اشتیاق احمد کا یہ "تشریحی نوٹ" کسی تبصرہ کا محتاج نہیں۔ بے شبہ شیخ سعدی شعر و ادب کی دنیا میں بلند مقام رکھتے ہیں' لیکن انہیں علمی حلقوں میں کبھی بھی ہندو مت پر سند تسلیم نہیں کیا گیا' ویدوں کے بارے میں اہل نظر جانتے ہیں کہ "ان کی تالیف کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی' کیونکہ ان میں سے اکثریت کی زبان نہایت فصیح ہے' لیکن سکالرز کی اکثریت کے ہاں اس کا زمانہ پندرہ سو اور بارہ سو سال قبل از مسیحؑ قابل قبول ہے۔" رہا شنکر اچاریہ کا عہد' تو آپ کو آٹھویں صدی عیسوی کا مایہ ناز فلسفی قرار دیا گیا ہے۔ برہمن فلسفہ میں اس سے بڑا کوئی نام نہیں' ہندو فکر پر شنکر اچاریہ سے بڑھ کر کسی دوسرے مفکر نے اثر نہیں ڈالا۔" یہ باتیں مذہب اور عام معلومات

سے متعلق کسی بھی مستند دائرۃ المعارف میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ شنکر اچاریہ وہی ہیں جن کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے کہا تھا: "ہم گہرے فلسفیانہ شعور میں ہندومت کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں، ظہور اسلام کے بعد عربوں کی تاریخ شاندار عسکری فتوحات کا ایک طویل سلسلہ ہے، اس نے انہیں ایک ایسا طرز زندگی اختیار کرنے پر مجبور کیا، جس میں فلسفہ و علوم کے عظیم میدانوں میں نسبتاً خاموش فتوحات کرنے کے لیے بہت ہی کم فرصت تھی، اس لیے وہ (عرب) کپل (Kapil) اور شنکر اچاریہ (Sankaracharya) جیسی شخصیتیں نہ پیدا کر سکے نہ کر سکتے تھے۔"(۲۹)

مولانا مرحوم نے قبلہ نما میں بعض دوسری باتیں بھی لکھی ہیں، جو میدان مناظرہ میں شاید سود مند ہوں، لیکن علمی کتاب میں انہیں مشکل ہی سے جگہ ملے گی، مثلاً مولاناؒ ایک جگہ فرماتے ہیں: "احادیث اہل اسلام میں یہ بات مصرح ہے کہ خانہ کعبہ اور بیت المقدس کی تعمیر میں چالیس برس کا تفاوت ہے اور یہ بھی بعض روایات میں ہے کہ اول روئے زمین پر فرشتوں نے کعبہ اور بیت المقدس کو بنایا تھا، مگر طوفان نوح میں وہ دو نو تعمیریں آسمان پر اٹھالی گئیں" (ص ۲۵۷)۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر مولاناؒ آج زندہ ہوتے، تو وہ نہ صرف اپنی کتابوں پر نظرثانی فرماتے اور بعض اسرائیلی روایات کو حذف کر دیتے بلکہ مدرسہ کے نصاب تعلیم میں بھی تقابل ادیان کے مضمون کا اضافہ فرماتے، مولاناؒ کے عہد میں ہندو دھرم پر تحقیق و تنقید کا وہ کام اہل دیوبند کے سامنے نہیں آیا تھا، جو آج ہمارے سامنے ہے۔ یہی حال اسلامیات میں کلاسیکی ادبیات کا ہے، مدرسہ کے نصاب میں تقابل ادیان کے مضمون کا اضافہ کوئی جدت یا بدعت نہیں ہو گی، بلکہ اپنے اسلاف کی علمی روایت کا احیا ہو گا۔ عبدالکریم شہرستانی،

ابن حزم اور البیرونی نے اپنی تصنیفات میں دوسرے مذاہب کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ آج دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرنے کے لیے وقت نے جو آسانیاں ہمیں فراہم کر دی ہیں' وہ شاید ہمارے اسلاف کے حصہ میں نہیں آئیں۔ چنانچہ موجودہ وقت میں تقابل ادیان کے مضمون سے تغافل برتنا ہماری علمی زندگی کے لیے کسی طرح بھی سودمند نہیں۔

مولاناؒ نے قبلہ نما میں اپنے دل پسند موضوع یعنی رسول کریمؐ کی ختم نبوت کے اسرار و رموز پر بھی لکھا ہے' مولانا نے اس اہم مسئلہ پر لکھتے ہوئے کہا ہے کہ رسول اکرمؐ کی نبوت ذاتی ہے' جس سے دوسرے انبیاء کرام نے فیض پایا ہے' جیسے سورج کی روشنی اس کی ذاتی ہے' چاند ستاروں کی روشنی سورج کی رہین منت ہے۔اسی طرح تمام انبیاء کی نبوت آفتاب نبوت (رسول اکرمؐ) کی رہین منت ہے۔ مولاناؒ نے اس سلسلہ میں مزید کہا کہ رسول اکرمؐ کی ذات گرامی تجلی اول ہے' جو ذات باری تعالیٰ کے تمام کمالات و محاسن کی مظہر ہے' چنانچہ حقیقت محمدیہؐ کہ خدائی کمالات و محاسن کی جلوہ گاہ ہے' مصدر کائنات ہے "اس لیے ملائکہ ہوں یا جنات' بنی آدم ہوں یا حیوانات' کمال علمی و عملی میں اسی طرح حضرت خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست نگر ہوں گے جیسے قمر و کواکب دست نگر آفتاب"------ سو حضرت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو "بمقابلہ خداوند عالم" بوجہ مصدریت عالم امکان ایسا سمجھئے جیسا بمقابلہ بادشاہ ہفت اقلیم بادشاہ اصغر ہوتا ہے" (ص ۳۹۲' ۴۰۳)' مولانا نے تقریباً یہی باتیں اپنی کتاب "اجوبہ اربعین" میں کہی ہیں۔ اسی مضمون کو انہوں نے اپنی کتاب "آب حیات" اور "تحذیر الناس" میں بیان کیا ہے کہ رسول اکرمؐ کی نبوت بالذات ہے اور دوسرے انبیاء کی نبوت بالعرض۔ مولانا مرحوم کے انہی خیالات کو کہ رسول اکرمؐ کی نبوت ذاتی ہے' مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے

تفسیری نوٹز میں جو حضرت شیخ الہند کے ترجمہ قرآن پر ہیں' (دیکھئے سورۃ احزاب' آیت خاتم النبیین) اور مولانا محمد طیب نے اپنی کتاب "آفتاب نبوت" مں پیش کیا ہے۔

مولانا نانوتویؒ نے "اجوبہ اربعین" میں جو اصحاب تشیع کے چند سوالات کے جواب میں ہے' حرمت متعہ پر بحث کی ہے' اس بحث میں شادی کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا کہ وہ نفسانی خواہشات کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ حصول اولاد کے لیے ہوتی ہے' مزید یہ کہ ایام حمل میں ماں کے دل و دماغ میں جو خیالات و جذبات دوڑتے ہیں یا اس کی آنکھیں جن مناظر کو دیکھتی ہیں' ان سے بچہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا' یہی وجہ ہے کہ حضرت جبریلؑ حضرت مریم کے پاس انسان کی شکل میں آئے' اگر فرشتے کی صورت میں سامنے آتے تو حضرت مریم خوف زدہ ہو جاتیں' جس سے حضرت مسیحؑ کے اخلاق متاثر ہوتے اوران کے کردار میں بزدلی اور خوف کے اثرات دیکھے جاتے۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ ایک پیغمبر کا بلند کردار اس قسم (بزدلی) کی آلائشوں سے پاک ہوتا ہے۔ مولانا کے اس لطیف نکتہ پر یہاں ایک دوسرے واقعہ کا ذکر بے جا نہ ہو گا' کہتے ہیں:

> "فرانس میں خوب صورت والدین کا بچہ جب سیاہ رنگ اور حبشیوں کی سی صورت پر پیدا ہوا' تو ڈاکٹروں کو اس اختلاف پر سخت حیرت ہوئی' تحقیق سے ثابت ہوا کہ زمانہ حمل میں ماں کی نشست کے سامنے ایک حبشی کا اسٹیچو (مجسمہ) رہا کرتا تھا' جس کی سیاہیت اور رنگ کا اثر نگاہوں کے ذریعہ دماغ میں پہنچا اور ذہن کو اس طرف غیر معمولی توجہ ہو گئی' اسی کا نتیجہ ہے کہ بچے کو والدین کی صورت

سے کوئی تعلق نہ رہا اور اسی حبشی کی ڈیل ڈول پر پیدا
ہوا۔"(۳۰)

مولانا نے "اجوبہ" میں حرمت متعہ پر وزنی دلائل دیئے ہیں' مولانا نے ان آثار کی نفیس توجیہ کی ہے جن میں حلت متعہ کا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا نے باغ فدک کے مسئلہ پر بھی لکھا اور یہ "نکتہ" پیدا کیا کہ وراثت مرنے والی کی جائیداد میں جاری ہوتی ہے' رسول اکرمؐ پر میراث کی آیت کا اطلاق نہیں ہوتا' کیوں کہ آپ اپنی قبر میں زندہ ہیں۔ آپ کے جسد اطہر پر موت اس طرح وارد نہیں ہوئی' جس طرح وہ دوسرے انسانوں پر وارد ہوتی ہے' مولانا نے اسی خیال کو اپنی دوسری کتاب "آب حیات" جو ان کی کتاب "ہدایہ الشیعہ" کا ضمیمہ ہے' پیش کیا ہے۔ مولانا نے اس بحث میں شیعہ علماء کے افکار کو بھی پیش کیا ہے' جس سے ان کی وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔ آپ نے علامہ حلی کی "منہاج الکرامہ" کے حوالہ سے لکھا ہے:

"جب حضرت فاطمہ نے فدک کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ
کو نصیحت کی تو آپ نے اس کے متعلق تحریر لکھ دی اور
فدک حضرت فاطمہؓ کو واپس کر دیا۔" (اجوبہ ص ۳۰۷)

ہم یہاں مولانا مرحوم کی تحریروں پر مفصل تبصرہ کرنا نہیں چاہتے' جس کے لیے فرصت کے منتظر ہیں' البتہ یہاں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مولانا نانوتویؒ کی بعض تحریروں سے اختلاف کے باوجود' وہ صحیح معنی میں ایک عالم اور عارف باللہ تھے' وہ شریعت مقدسہ کے احکام اور ان کے فلسفہ سے آگاہ تھے اور معنوی زندگی کے اسرار و رموز سے باخبر' وہ بہ قول صاحب مذہب منصور" حضرت امام اعظم اور حضرت محی الدین ابن عربی اور مجدد الف ثانی کے کمالات اور حالات کے نہایت معتقد تھے۔ عمل ان کا حنفی تھا مگر ہر سنت کے اتباع میں

بہت خیال رکھتے تھے۔" یہی وجہ ہے کہ ان کے افکار میں ایک اعتدال اور توازن ہے اور ان کی نگاہ میں گہرائی۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے عہد کے حالات کے پیش نظر مسلمانوں سے کہا تھا کہ وہ "ہندو مسلم اتحاد کی غرض سے گائے کی قربانی ترک کرسکتے ہیں۔" (۳۱) اسی قسم کا مشورہ بابر نے ہمایوں کو دیا تھا' اس مشورے سے مولانا کی گہری سوچ کا پتہ چلتا ہے۔ ہماری مجلس معارف القرآن دارالعلوم سے اپیل ہے کہ وہ مولاناؒ کی تحریروں کا ایک خوبصورت انتخاب شائع کرے' جس میں افکار' خیالات' لطائف اور دقائق تو مولانا کے ہوں' لیکن اسلوب بیان اور الفاظ و تراکیب کا سانچہ نیا ہو' ہمیں امید ہے کہ اہل علم ایسے انتخاب کا خیر مقدم کریں گے۔

مولانا محمود حسن (۱۸۵۱ء - ۱۹۲۰ء)

علمی دنیا میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کا تخلیقی کارنامہ حصول علم کے لیے سنگ و خشت کی عمارتوں کا قیام یا قرطاس و ورق پر حرف و حکایت کے نقوش کو ثبت کرنا نہیں ہے' ان کا تخلیقی کارنامہ ان کے وہ شاگرد ہیں' جنہیں ان کے آتشیں نفس نے نئی زندگی عطا کی ہے اور جنھوں نے مولانا کے مقدس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے جدوجہد کی ہے۔ ان شاگردوں میں سرفہرست مولانا محمود حسن ہیں جو آج برصغیر کے مذہبی حلقوں میں شیخ الہند کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ مولانا محمود حسن نے اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے مدرسہ دیوبند کو دارالعلوم کے مقام تک پہنچایا اور پھر اس کا رشتہ تحریک آزادی کے ساتھ جوڑا' جس نے آگے چل کر برصغیر کی سیاسی تاریخ میں ایک منفرد کردار ادا کیا۔

مولانا دارالعلوم کے پہلے طالب علم ہیں' وہ ابھی درس نظامی کی تحصیل سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ۱۸۷۲ء میں مدرسہ ہی میں پڑھانا شروع کر دیا اور اپنی خداداد ذہانت کا لوہا منوایا حتیٰ کہ چھ سال بعد آپ نے اپنے استاذ محترم

(مولانا نانوتوی) کی زندگی ہی میں بخاری شریف کا درس دیا۔ مولانا نے تقریباً چوالیس (۴۴) سال تک مسند تدریس پر بیٹھ کر تعلیم و تربیت کا تاریخی کارنامہ سرانجام دیا۔ مولانا کے عہد میں مدرسہ کی شہرت و مقبولیت دور دور تک پہنچ گئی اور ان کے حلقہ تدریس سے ایسے لوگ باہر آئے جو ایک مدت تک ملک کی مذہبی، اخلاقی اور سیاسی زندگی میں پیش پیش رہے۔ مولانا محمد انور شاہ کشمیری، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ دہلوی اور مولانا سید حسین احمد مدنی (رحمتہ اللہ علیہم) اسی کہکشاں کے ستارے ہیں جو مولانا کے آفتاب علم کے نور سے جگمگا رہی ہے۔ مولانا نے تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا۔ مولانا نے اپنی جوانی میں "ادلہ کاملہ اور ایضاح الادلہ" کے نام سے دو کتابیں لکھیں، جن میں نماز سے متعلق چند فروعی مسائل میں حنفی نقطہ نظر بیان کیا، یہ کتابیں دراصل پنجاب کے ایک عالم کے جواب میں لکھی گئی ہیں، جنہوں نے نماز میں رفع یدین، قرات فاتحہ خلف الامام، آمین کا جھرا" کہنا سنت اور ان مسائل میں حنفی موقف خلاف سنت قرار دیا تھا، مولانا نے حنفی موقف کی تائید میں لکھا، لیکن اسلوب بیان میں علمی پختگی کی بجائے "نوجوانی کی تیزی اور شوخی نمایاں ہے۔" اسی سلسلہ کی ایک کتاب "احسن القری" بھی ہے جس میں دیہات میں نماز جمعہ کے قیام کا مسئلہ زیر بحث آیا ہے۔

مولانا نے ایک دوسری کتاب " جهد المقل فی تنزیه المعز و المزل" کے نام سے لکھی، یہ کتاب دراصل شاہ اسماعیل شہید کے ناقدین کے جواب میں ہے۔ جنہوں نے مسئلہ امکان کذب اور امکان نظیر پر نہ صرف مولانا شہید سے اختلاف کیا بلکہ ان کے خلاف رکیک زبان بھی استعمال کی، جس کی وجہ سے مولانا کو مجبورا" قلم اٹھانا پڑا۔ امکان کذب کا مسئلہ ایک پرانا مسئلہ ہے،

اسلام کے صدر اول میں یہ سوال اٹھا کہ قرآن مجید میں گناہ کبیرہ کے مرتکب کے لیے (اگر وہ بن توبہ کیے مرجائے) عتاب کی جو وعید آئی ہے' کیا یہ وعید پوری ہو کر رہے گی؟ معتزلہ اور خوارج نے کہا کہ ہاں! یہ وعید پوری ہو کر رہے گی' ایسا کرنا (گناہ کبیرہ کے مرتکب کا سزا پانا) خدا کے لیے واجب ہے' اگر خدا نے ایسا نہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ خدا نے وعید کی جو خبر دی تھی' وہ صحیح نہیں تھی' اس صورت میں خدا کے لیے کذب اور وعدہ خلافی لازم آتی ہے' حالانکہ اس کی ذات ہر عیب و نقص سے پاک اور منزہ ہے۔ آگے چل کر اس بحث کا رشتہ خدا کی ذات سے جوڑ دیا گیا اور کہا گیا کہ کیا خدا ظلم کرنے یا جھوٹ بولنے پر قادر ہے؟ ایک گروہ نے کہا کہ یہ باتیں (ظلم کرنا یا جھوٹ بولنا) اس کے دائرہ قدرت میں تو داخل ہیں' لیکن ان کا صدور ممکن نہیں کیوں کہ یہ امر اس کی شان قدوسیت کے منافی ہے' دسرے گروہ نے کہا کہ ظلم یا کذب خدا کے دائرہ قدرت میں داخل ہی نہیں کیوں کہ یہ بات اس کی شان کمال کے منافی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کے ہاں۔ معتزلہ ہوں یا اشاعرہ' خوارج ہوں یا شیعہ۔ خدا کی ذات گرامی ہر نقص و قبح سے پاک ہے' تنزیہ کا یہی نظریہ ہے جس نے معتزلہ سے امکان کذب کا اقرار کرایا' وہ یوں کہ ان کے ہاں قدرت کا یہی تقاضا ہے' اگر وہ ظلم یا کذب پر قادر نہیں' تو اس سے خدا کا "عجز" لازم آتا ہے جو ایک نقص ہے' جس سے خدا کی ذات بالاتر ہے۔ اشاعرہ نے مزید کہا کہ یہ تصور کہ خدا ظلم کرنے پر قادر ہے لیکن اس کا صدور اس کی ذات پاک سے محال ہے۔ نظریہ تنزیہ کے زیادہ شایان شان ہے۔

رہا امکان نظیر کا مسئلہ تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مثیل و نظیر پیدا کرنے پر قادر ہے۔ مولانا شہید ان دونوں

مسائل میں امکان کے قائل ہیں۔ البتہ ان کا صدور محال جانتے ہیں۔ مولانا فضل حق مرحوم امتناع نظیر کے قائل ہیں' واقعہ یہ ہے کہ دونوں (مولانا شہید اور مولانا فضل حق) امکان نظیر کو عملاً محال گردانتے ہیں' لیکن نظری طور پر ایک (مولانا شہید) امکان نظیر کے قائل ہیں اور دوسرے امتناع نظیر کے' حقیقت یہ ہے کہ خدا کی قدرت اور مشیت کا مسئلہ ایک خاص فکری اور قیاسی مسئلہ ہے' جسے علم کلام کی کلاسیکی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

مولانا موصوف نے اپنی کتاب میں اہل سنت کا موقف بیان کیا اور علم کلام کے پرانے ابحاث پر۔ کلام اللہ' کلام لفظی' کلام نفسی' قرآن کے الفاظ کا قدیم یا حادث ہونا۔ تفصیل سے لکھا' یہ قدیم بحث اب شاید اہل علم کے لیے اپنے اندر دلچسپی کا کوئی سروسامان نہیں رکھتی' لیکن مولانا موصوف نے مجبورا اس مشکل اور نازک مسئلہ پر قلم اٹھایا اور بڑی خوبی سے اسے نبھایا' لیکن اس حقیقت سے مجال انکار نہیں کہ اس قسم کے مسائل نے مسلمانوں کے باہمی اختلاف و نزاع میں شدت پیدا کی' شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا موصوف اپنی پختہ عمر میں اس قسم کے مسائل میں الجھنے کی بجائے مسلمانوں کے بنیادی مسائل سے سروکار رکھتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی علمی زندگی کا شاہکار' جس نے مولانا کی علمی زندگی کو وقار اور تقدس بخشا' قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر ہے' یہ ترجمہ دراصل شاہ عبدالقادر دہلوی کے کامیاب اردو ترجمہ کا نقش ثانی ہے۔ مولانا نے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں شاہ صاحب کے ترجمہ کی فنی خوبیوں اور ادبی لطافتوں پر خوبصورت بحث کی ہے' جس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا عربی اور اردو زبان کے مزاج سے شناسائی رکھتے ہیں' کیونکہ قرآن مجید جیسی منفرد کتاب کا ترجمہ وہی شخص کرسکتا ہے جو دونوں زبانوں کے مزاج' تراکیب' محاوروں اور اسالیب

بیان سے واقف ہو، اسے علم ہو کہ ترجمہ میں اردو کے کون سے الفاظ، جملے اور محاورے، قرآن مجید کے حکیمانہ اسلوب بیان کی نزاکتوں اور لطافتوں کی صحیح ترجمانی کرسکتے ہیں، چنانچہ مولانا مرحوم نے "اپنے ترجمہ" میں متروک الفاظ کی جگہ نئے الفاظ کا انتخاب کیا اور وہ بھی علماء ہی کے تراجم سے، ایسے ہی آپ نے بعض مقامات پر محاوروں پر نظرثانی کی، مولانا نے یہ کام بڑی محنت اور ریاضت سے جاری رکھا، ابھی چھ پاروں کا ترجمہ کرپائے تھے کہ انہیں ابتلا و آزمائش کا مرحلہ پیش آگیا، مولانا ۱۹۱۷ء میں مکہ مکرمہ میں تھے کہ شریف حسین آف مکہ نے انگریز کے اشارے پر مولانا کو حرم کعبہ میں گرفتار کر کے جدہ میں برطانوی حکومت کے سپرد کر دیا۔ برطانوی حکومت نے مولانا اور ان کے چند جانثار ساتھیوں کو مالٹا میں نظربند کر دیا، مولانا نے بڑے سکون اور وقار کے ساتھ نئی آزمائش کا سامنا کیا اور اسے اپنے علمی مشاغل پر اثرانداز ہونے کی اجازت نہیں دی، مولانا تین سال تک مالٹا میں رہے اور اسی اسیری میں ترجمہ قرآن کا کام پورا کیا۔ پہلی چار سورتوں کے تفسیری نوٹ بھی مکمل کیے، ۱۹۲۰ء میں آپ کو رہا کر دیا گیا، مولانا وطن پہنچے ہی تھے کہ چھ ماہ کے بعد نومبر ۱۹۲۰ء میں آخرت کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ مولانا کی رحلت کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی (وفات ۱۹۴۹ء) نے بقایا تفسیری نوٹ مکمل کیے، مولانا عثمانی نے بڑی کامیابی سے اپنے سلیس، شگفتہ اور دلنشین اسلوب میں قرآن کے مطالب بیان کئے، چونکہ یہ تفسیری نوٹ مختصر اور جامع ہیں اور ان میں پورے حزم و احتیاط سے تفسیر بالروایت کا التزام کیا گیا ہے، اور علمی مسائل کے بیان میں علمی آداب کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے، اس لیے اس ترجمہ و تفسیر کو عالمگیر مقبولیت نصیب ہوئی اور قرآن مجید کے طالب علموں نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا، افغانستان میں اس کا فارسی اور پشتو زبانوں میں ترجمہ شائع کیا گیا، الغرض اس

ترجمہ و تفسیر سے دارالعلوم کے علمی وقار میں اضافہ ہوا۔

مولانا نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں دو نمایاں علمی کام سرانجام دیئے، جن سے ان کی بالغ نظری، گہری بصیرت اور روح عصر سے ان کی شناسائی کا پتہ چلتا ہے۔

ا۔ مولانا قرآن مجید کی تفسیر و تاویل سے گہرا شغف رکھتے تھے، اسی شغف کا نتیجہ موجودہ ترجمہ قرآن ہے، جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اگر مولانا کچھ مدت اور دنیا میں رہ جاتے، تو ہمیں یقین ہے کہ وہ قرآن مجید کے مطالعہ و تحقیق کے لیے دارالعلوم میں ایک مستقل شعبہ قائم کرتے، جو قرآن کے انگریزی اور ہندی ترجمے کا بیڑہ اٹھاتا۔ ارباب مدرسہ کو اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ موجودہ وقت میں دارالعلوم قرآن مجید کے پیغام کی اشاعت کے لیے انگریزی اور ہندی زبانوں میں کیا کچھ کرسکتا ہے؟ نیز یہ کہ اس سلسلہ میں مشرق اور مغرب میں جو علمی کام ہو رہا ہے، دارالعلوم کا شعبہ تصنیف و تالیف اس سے کہاں تک آگاہ ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ وقت میں کسی علمی ادارے کا اپنے معاصر اداروں سے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں رہا۔

۲۔ مولانا اپنی وفات سے چند دن قبل اپنی بیماری اور بڑھاپے کے باوجود علی گڑھ تشریف لے گئے اور علم کے قدیم اور جدید دھاروں کو یک جا کرنے کی کامیاب کوشش کی، جس کے نتیجہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، وجود میں آیا، مولانا نے علی گڑھ کے طالب علموں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

> "اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد
> کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلتی جا رہی ہیں)
> مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں
> زیادہ ہیں، تو میں نے دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا، کچھ

بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت مجھ کو اپنے بزرگوں کے
مسلک سے منحرف بتائیں' لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس
قدر میں علی گڑھ کی طرف آیا' اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ
میری طرف آیا۔" (۳۲)

یہاں مولانا نے اپنے خطاب میں "اپنے بزرگوں کے مسلک" کی طرف جو اشارہ کیا ہے' اس سے مراد غالباً" مولانا محمد یعقوب کا وہ خط ہے جو آپ نے (مولانا محمد یعقوب) مرحوم سرسید احمد کے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا' اور اس امر پر معذرت کی تھی کہ وہ (محمد یعقوب) اور مولانا محمد قاسم نانوتوی' علی گڑھ مسلم کالج کی مشاورتی کمیٹی کے ممبر بننے سے معذور ہیں۔ سرسید مرحوم نے مولانا محمد یقوب کے اس خط پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ بھی کیا تھا۔ (۳۳) مولانا شیخ الہند نے اپنے بزرگوں کے اس مسلک (عزلت نشینی) کے خلاف علی گڑھ سے رشتہ استوار کرنا ضروری جانا' کیوں کہ وقت کا تقاضا یہی تھا اور اسی تعاون میں مسلم جماعت کا ملی مفاد مضمر تھا۔ مولانا کے اس تاریخی خطاب سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح ہوگا کہ دارالعلوم کے نصاب تعلیم پر نظرثانی کا کام مسلسل جاری رہنا چاہیے' مولانا کی علمی تمناؤں کو پورا کرنے کی یہی ایک صورت ہے کہ علم کے جدید دھارے کو جس کی نمائندگی علی گڑھ کے حصہ میں آئی ہے' دارالعلوم اپنے نصاب تعلیم میں جذب کرلے اور مسلمانوں کے نظام تعلیم کی تاریخی وحدت کو واپس لانے کے لیے اپنا کردار ادا کرے۔ وقت کا یہی مطالبہ ہے اور برصغیر کے اجتماعی حالات کا یہی تقاضا۔

مولانا شیخ الہند (محمود حسنؒ) کے بعد بھی ان کے ممتاز شاگردوں اور عقیدت مندوں نے تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھا' مولانا اشرف علی تھانوی یا مولانا شبیر احمد عثانی کی شخصیت اور علمی خدمات پر لکھنے کے لیے ایک علیحدہ

کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں پر ہم یہ لکھنے پر مجبور ہیں کہ مولانا تھانوی کی تفسیر "بیان القرآن" ایک سنجیدہ اور قیمتی تفسیر ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے معروف و مفید ترجمہ و تفسیر کا بنیادی ماخذ تفسیر بیان القرآن ہی ہے۔ مولانا تھانوی نے اپنے آپ کو تربیت و تزکیہ اور سلوک و تصوف کے لیے وقف کر دیا تھا' اس لیے انہوں نے اس میدان میں ٹھوس اور مفید خدمات سرانجام دیں' روحانی امراض کی دریافت اور ان کے علاج کے لیے انہوں نے جو نازک اور لطیف نکتے پیدا کئے ہیں' وہ تصوف کا قیمتی سرمایہ ہیں' جس سے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے کسب فیض کیا ہے' وقت کے جدید مسائل بھی علمائے دیوبند کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے سیکولرازم پر مقالات لکھے اور بعض مقامات پر مسلمانوں کے متضاد موقف پر بھی تنقید کرتے ہوئے لکھا:۔

> "مسلمان اقلیت میں ہوں تو سیکولر ازم کو بہتر نظام حکومت جانتے ہیں' اکثریت میں ہوں تو "اسلامی حکومت" کا نعرہ لگاتے ہیں' یہ خود غرض سیاست نہیں تو کیا ہے؟ یہ موقف' اسلام کے فلسفہ اخلاق' تعلیمات کے خلاف ہے' فقہ کی کتابوں میں ہے کہ اگر غیر مسلم ہمارے تاجر پر ایک روپیہ ٹیکس لیتا ہے تو ہمیں اس سے کم لینا چاہیے' اس لیے کہ " نحن احق بالمکارم و الاخلاق" اگر غیر مسلم حکومت سیکولر ازم اختیار کرتی ہے اور تمام مذاہب کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھتی ہے' تو یہی بات ہمیں اپنے ملک میں غیر مسلموں سے کرنی چاہیے۔" (۳۴)

مولانا نے مسلمانوں کو سیاست میں حقیقت پسندی کی راہ پر چلنے کا

مشورہ دیتے ہوئے کہا:۔

"اسلام حقائق کا مذہب ہے' اس کی نگاہ اعلیٰ مقصد پر رہتی ہے' وہ کسی عنوان پرستی کا قائل نہیں' اگر ایسا ہوتا تو صلح حدیبیہ وجود میں نہ آتی' دنیا میں امن و اماں' عدل و انصاف کا قیام' عام انسانوں کی فلاح و بہبود' رفاہیت کا سروساماں تیار کرنا' اسلامی حکومت کا قیام ہے... شخصی حکومت' ڈکٹیٹرشپ' اسلامی بھی ہوسکتے ہیں غیراسلامی بھی' اسی طرح سیکولر' اسلامی اور غیراسلامی بھی ہوسکتا ہے اگر اس میں اسلام کا قانون عدل نافذ ہے' تو اسلامی ہے۔"

(۳۵)

ہرچند ارباب دیوبند نے اسلام کے سیاسی نظام پر زیادہ نہیں لکھا' لیکن انہیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اس موضوع پر پوری مسلم دنیا نے کچھ نہیں لکھا' واقعہ یہ ہے کہ عہد حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام پر لکھنا ایک "نازک مسئلہ" ہے' کیونکہ نہ صرف عوام بلکہ علماء تک اپنے "سیاسی نظام" پر تنقید سننے کے لیے تیار نہیں ہیں' علی عبدالرازق کی معروف کتاب "اصول الحکم فی الاسلام" پر ۱۹۲۴ء میں علمائے ازہر اور مرحوم رشید رضا نے علمی تنقید کی بجائے جو جذباتی راہ اختیار کی' اس سے اہل علم واقف ہیں' لیکن علمائے دیوبند نے سیاست میں اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:۔

جہاں تک ہمارے معلومات ہیں' میں وثوق سے کہتا ہوں کہ قاضی القضاۃ علامہ ابو الحسن ماوردی رحمتہ اللہ علیہ' متوفی ۱۰۵۸ھ' اول وہ بزرگ ہیں' جنہوں نے پورے نظام اسلام کو کسی قدر بسط و تفصیل کے ساتھ یک جا کرنے کے

لیے قلم اٹھایا ہے' جزاہ اللہ عنی و عن المسلمین" اس کے بعد علامہ رشید رضا' مدیر المنار' خلافت کے مسئلہ پر المنار کے صفحات میں مضامین لکھتے رہے... یہ کتنی بدقسمتی ہے کہ تمام مسائل پر مستقلاً" متعدد تصانیف موجود ہیں' لیکن کیا' نظام اسلام' پر بھی کوئی کامل و مکمل تالیف موجود ہے... علمائے ربانیین اور علوم شریعہ کے ماہرین سے ایک بڑی کوتاہی یہ ہوئی ہے کہ اجتماعی زندگی اور حکومت اور سیاست مدن سے متعلق جو ان کے (علماء) فرائض تھے' ان سے کسی نہ کسی وجہ سے چشم پوشی کی گئی اور کماحقہ فرض ادا نہیں کیا گیا۔" (۳۶)

یہ الفاظ مولانا ابوالحاسن محمد سجاد نے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس مراد آباد (۱۹۳۵ء) سے خطاب کرتے ہوئے کہے' علمائے دیوبند کے کھلے اجلاس میں انہی کے ایک فرد کا یہ کہنا کہ تیرہ سو برس میں مسلم دنیا نے سیاست کے موضوع پر صرف دو کتابیں لکھی ہیں' اخلاقی جرات کا کام ہے' یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو تلاش حق کے لیے ذوق مطالعہ و تحقیق رکھتا ہو اور قبولیت عامہ کے فتنہ سے آشنا' اس علمی مزاج اور تاریخی شعور کے باوجود ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ دارالعلوم نے سیاسی موضوع پر کوئی دقیع علمی کام نہیں کیا' جس سے ہمیں اپنا سیاسی محاسبہ کرنے اور ژولیدگی فکر سے نجات حاصل کرنے میں مدد ملتی۔ وقت کے بعض ضروری مسائل بھی ان کی نگہ التفات کا مرکز نہ بن سکے' موجودہ وقت میں ہیگل اور مارکس نے اپنی فلسفیانہ تحریروں سے نہ صرف لاکھوں انسانوں کے طرز فکر کو متاثر کیا ہے' بلکہ پوری دنیا کے ایک بڑے حصہ پر اس کے سیاسی و معاشی نظام کو تہ و بالا کر کے اپنا نظام بھی قائم کر دیا ہے' جس

سے پوری دنیا کے نظامہائے سیاست و معیشت متاثر ہوئے ہیں۔ مغرب میں اصحاب علم اور ارباب سیاست کے علاوہ مذہبی علماء نے بھی دونوں کے افکار کا سنجیدگی سے جائزہ لیا ہے' جس سے مارکس کی تحریروں کے جلو میں آنے والی مادی یلغار کو جو آرٹ' فلسفہ' سیاست' تاریخ سے متعلق صدیوں پرانے انسانی افکار کو تاراج کرتی ہوئی سرزمین مذہب کی طرف بڑھ رہی تھی' روکنے میں مدد ملی۔ واقعہ یہ ہے کہ مغرب میں انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب نے مزدوروں کے لیے نئی مشکلات پیدا کر دی تھیں' سرمایہ داروں نے بڑی بے رحمی سے محنت کشوں کا استحصال کیا اور اپنی شرائط پر ان کی محنت کو خریدا' اس نازک وقت میں مارکس نے غریب مزدوروں کی آزادی کے لیے اپنا فلسفہ عمل پیش کیا جس میں اس نے نہ صرف اپنے وقت کے سیاسی نظام کو چیلنج کیا' بلکہ اجتماعی زندگی سے متعلق صدیوں پرانے انسانی افکار کو بھی چیلنج کیا' اس کی رائے میں اقتصادی مسائل معاشرہ میں بنیادی کردار ادا کرتے رہتے ہیں' ہم مذہب' آرٹ' سیاست' سائنس کے میدان میں انسانی سرگرمیوں کی داستاں کو اقتصادی و معاشی مسائل سے الگ کر کے سمجھ نہیں سکتے' مارکس بقول رسل یہ سمجھتا ہے کہ دنیا جدلیاتی فارمولہ کے مطابق ارتقا کر رہی ہے' لیکن وہ ہیگل سے اس بات پر قطعی اتفاق نہیں کرتا کہ اس ارتقاء کے پیچھے کونسی طاقت کام کر رہی ہے... مارکس کے نزدیک یہ طاقت مادہ (Matter) ہے روح (Spirit) نہیں... اس کا مطلب یہ ہے کہ مادہ اور انسان کے باہمی تعلقات ہی دراصل یہی طاقت ہیں' جس کا سب سے اہم حصہ انسان کا طریقہ پیداوار ہے۔" (۳۷)
چنانچہ مارکس یہ سمجھتا ہے کہ سوسائٹی ہمیشہ انہی لوگوں کے زیر اثر رہی ہے جو ذرائع پیداوار کے مالک تھے اور جب کبھی نئے ذرائع پیداوار کا انکشاف ہوتا ہے تو اقتدار اسی طبقہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو نئے ذرائع پیداوار کا مالک ہوتا

ہے۔ چنانچہ حکمران گروہ کی غلامی سے رہائی کی ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت میں دے دینا۔ بہرنوع مارکس کی زوردار تحریروں نے دنیا کی بزم سیاست و معیشت میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ برصغیر میں علامہ اقبال کی بعض سحر آفریں نظمیں اور جواہرلال نہرو کی خوب صورت تحریروں نے اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں ہمارے نوجوانوں کو مارکس' لینن اور سوشلزم کا شیدا بنا دیا تھا اور وہ اشتراکیت کے علاوہ کسی دوسری حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ علامہ اقبال کی شہرۂ آفاق نظم "لینن (خدا کے حضور میں)" آج بھی برصغیر کے لاکھوں انسانوں کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ مغربی تمدن' سیاست اور معیشت کی حقیقت کو آشکارا کرنے میں اردو ادب نے اس سے بہتر شاید ہی کوئی دوسری نظم لکھی ہو' اس نظم میں لینن خدا سے یوں ہمکلام ہے:۔

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟
وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات؟

یہ علم' یہ حکمت' یہ تدبر' یہ حکومت
پیتے ہیں لہو' دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ

دنیا ہے تیری منتظر روز مکافات

غرضیکہ برصغیر کی اجتماعی زندگی میں اشتراکیت نے ایک تلاطم بپا کر دیا تھا، لیکن مذہبی حلقے اس نئی صورت حال کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے، چنانچہ دارالعلوم نے نہ تو سوشلزم یا کمیونزم پر کوئی علمی کتاب لکھی اور نہ ہی جمہوری یا سیاسی نظام پر کوئی تحقیقی کام کیا، صحیح بات تو یہ ہے کہ علماء کی پوری جماعت نے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مکتب خیال سے ہو، اس موضوع پر نہیں لکھا، البتہ مرحوم مولانا مودودی نے ۱۹۳۹ء میں ہیگل اور مارکس کے فلسفہ تاریخ پر دو ایک عمدہ مضمون لکھے، مولانا ابوالکلام نے سورۃ توبہ کی تفسیر میں نہایت ہی اختصار سے سوشلزم پر ایک نوٹ لکھا، البتہ آزادی ہند کے بعد انہوں نے سوشلسٹ طرز کے سماج کے موضوع پر کانگریس کے ساٹھویں اجلاس میں ایک زبردست تقریر کی، جس میں انہوں نے بتایا کہ دولت کی منصفانہ تقسیم کے بارے میں مارکس نے جو ایک عظیم مفکر تھا، جو وسائل اختیار کئے، وہ بذات خود ایک مقصد بن گئے۔ جس سے ذرائع پیداوار کو نقصان پہنچا، حالاں کہ مارکس کا مقصد یہ تھا کہ پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے، لیکن بنیادی مقصد دولت کی منصفانہ تقسیم ہے۔ جدید ایران کے پہلے صدر ابوالحسن بنی صدر نے اپنی کتاب ""اسلامی حکومت"" میں لکھا ہے کہ جب اسلام کی ابتدائی تاریخ میں دولت کا سیلاب جزیرۂ عرب کی طرف آیا، اور مال دار لوگوں نے بڑے بڑے مکانات بنائے، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہ گیا تو ان مکانات کی دوسری یا تیسری منزل کو ڈھا دوں گا، تاکہ عام مکانات کے برابر ہو جائیں اور توحید کا مظہر بنیں۔" القصہ دولت کی منصفانہ تقسیم وقت کا سب سے اہم مسئلہ ہے، جس کی اہمیت کا تذکرہ علامہ اقبال اور قائد تک نے کیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس اہم موضوع پر دارالعلوم کی طرف سے کسی علمی کتاب کا نہ

آنا اس لیے موجب حیرت ہے کہ ارباب دیوبند ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک عملی طور پر تحریک آزادی میں پیش پیش رہے اور مسلمانوں کی اکثریت ان سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان کی متحرک اور ہنگامہ پرور شخصیتوں سے دلچسپی لیتی رہی۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر دارالعلوم کی طرف سے سیاست اور سوشلزم کے موضوع پر چند علمی کتابیں بازار میں آگئی ہوتیں' تو اس سے پڑھے لکھے لوگوں کو اپنی فکری اور سیاسی الجھنوں کو دور کرنے میں مدد ملتی۔

واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم ابھی تک تصنیف و تالیف کے میدان میں کوئی امتیازی مقام حاصل نہیں کر پایا۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس کا ماہوار رسالہ: دارالعلوم وعظ و ارشاد کی عام روش سے بلند ہو کر ایک علمی مجلہ نہ بن سکا' حتی کہ وہ اعظم گڑھ کے پرانے علمی مجلے: معارف کا مقام بھی حاصل نہیں کر پایا۔ اردو کے ساتھ ساتھ دارالعلوم اور دوسرے معروف دینی مدارس کو انگریزی اور ہندی مجلّے کا بھی انتظام کرنا چاہیے۔ موجودہ وقت میں اس امر سے تغافل برتنا صحیح نہ ہوگا۔

ماخذ و حواشی

۱۔ لائٹ نر (Leitner): پنجاب میں تاریخ تعلیم' (انگریزی) ص ۶۱۔ ۶۳

۲۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی رائے میں مرحوم دہلی کالج نے مدرسہ اسلامیہ' دیوبند اور علی گڑھ کالج کی شکل میں جنم لیا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں:۔ مولانا محمد قاسم دہلی کالج کے عربی حصہ کو دیوبند لے گئے اور سرسید احمد خان نے دہلی کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہنچا دیا۔" ملاحظہ ہو: شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک' لاہور' ۱۹۶۵ء ص ۱۳۷

۳۔ ابو الکلام آزاد: تذکرہ' ص ۲۷۰

۴۔/ معارف (اعظم گڑھ): فروری ۱۹۳۹ء' ص ۹۹

۵۔ عاشق الٰہی: تذکرۃ الرشید' میرٹھ' ج ۱ ص ۱۷۸

۶۔ ملاحظہ ہو خواجہ رضی حیدر: محدث سورتی' کراچی ص ۱۴۲۔ ۱۶۸ (ط۔ سورتی اکیڈمی): نیز "ابو الکلام کی کہانی خود ان کی زبانی" لاہور' ص ۱۲۰۔ ۱۲۲

۷۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ' ۲۴ر اپریل ۱۸۸۰ء' ص ۴۶۷' ۴۶۸ بحوالہ ماہنامہ "برہان" دہلی' اگست ۱۹۴۶ء ص ۱۲۰۔ ۱۲۳

۸۔ یادگار شبلی، لاہور ۱۹۷۱ء، ص ۳۵۷
۹۔ مکاتیب شبلی، اعظم گڑھ، ج ا ص ۳۰۶
۱۰ ایضاً: ص ۲۵۷
۱۱۔ عزیز الحسن: حسن العزیز، دہلی، ج ا، ص ۱۷۱
۱۲۔ عزیز الحسن: اشرف السوانح، لکھنؤ ۱۳۵۴ھ، ج ا، ص ۱۲۹
۱۳۔ محمد ظفیر الدین: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، ملتان، ط۔ مکتبہ امدادیہ، ج ا ص ۳۴ (پیش لفظ از مولانا محمد طیبؒ)
۱۴۔ ایضاً: ج ۲، ص ۲۲۸
۱۵۔ الطرق الحکمتہ فی السیاستہ الشرعیہ، قاہرہ، ص ۱۷ (فلما اکثر الناس من ذلک، عاقبھم بہ، ثم انہ ندم علی ذلک قبل موتہ کما ذکرہ الاسماعیلی فی مسند عمرؓ)
۱۶۔ فتاویٰ دارالعلوم، ۹/۱۳۴: کفایت المفتی، ملتان (ط۔ امدادیہ) ۶/ ۷۵ (مرتب حفیظ الرحمان واصف)
۱۷۔ فتاویٰ رشیدیہ، کراچی ۱۹۷۳ء، ص ۲۳۲ (ط۔ سعید کمپنی) اس ایڈیشن میں ناشر نے مولانا گنگوہی کے علاوہ دوسرے علماء کے آراء بھی نقل کر دیے ہیں۔ جس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔
۱۸۔ سید عقیل محمد: ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ، ط۔ ندوۃ المصنفین، دہلی، ص ۳۱
۱۹۔ ملفوظات آزاد، ۱/۱۲۱ (مرتب محمد اجمل)
۲۰ مرحوم مولانا مودودی نے لاؤڈ سپیکر کے بارے میں مولانا تھانویؒ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اسے بہ دلائل غیر صحیح قرار دیا تھا، سید مودودی صاحب نے اپنی تنقید میں علمی آداب کو بھی پوری

طرح سے ملحوظ رکھا تھا' جس کے نتیجہ میں مولانا تھانوی کی طبع حق پرست نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔ ملاحظہ ہو: تفہیمات' لاہور' ۱۹۷۰ء' ج ۱' ص ۴۶۱۔ ۴۶۷

۲۱۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ مولانا مودودی نے مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی کی کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: "اشتراکیوں کو راضی کرنے کی ایک تبلیغی کوشش ہے۔" لطف کی بات یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء میں مولانا پر "اسلامی سوشلزم" کا خارجی دباؤ اس قدر بڑھا کہ مولانا کی جماعت نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اپنے منشور میں زمین کی تحدید ملکیت سے متعلق "اشتراکی" نقطہ نظر کو تسلیم کر لیا اور یوں "مسئلہ ملکیت زمین" کے فاضل مصنف تقریباً اسی مقام پر آگئے جس پر سیوہاروی صاحب ۱۹۴۱ء میں کھڑے تھے اور مودودی صاحب کی تند و تلخ تنقید کا نشانہ بنے تھے' ملاحظہ ہو: ترجمان القرآن' دسمبر ۴۰' جنوری ۱۹۴۱ء' ص ۱۴۱۔ ۱۴۵

۲۲۔ ان مکاتیب میں جہاں تربیت و تزکیہ نفس کے مسائل زیر بحث آئے ہیں' وہاں ان میں اصحاب مکاتیب کے عہد کی اجتماعی زندگی کی ایک جھلک بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً مولانا مدنیؒ کے مکتوبات میں ان کے عہد کی بعض سیاسی اور مذہبی شخصیتوں کے افکار پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے' البتہ فاضل مرتب (نجم الدین اصلاحی) نے بعض مقامات پر (حاشیہ میں) غیر سنجیدہ زبان استعمال کی ہے۔

۲۳۔ اسلام اور جدیدیت: شکاگو یونیورسٹی' ص ۲۶' ۲۷

۲۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الرسالۃ القشیریہ' باب الفتوۃ

۲۵۔ ملاحظہ ہو: سید محبوب رضوی: تاریخ دارالعلوم دیوبند، مقدمہ از مولانا محمد طیبؒ

۲۶، ۲۶ اے۔ دارالعلوم دیوبند (دارالعلوم کی صد سالہ زندگی) ص ۲۴، ۲۵

۲۷۔ "رسالہ کانفرنس" مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، ص ۱۸، ۱۹ (صاجزادہ آفتاب احمد کی تقریر)

۲۸۔ محمد علی (ناظم ندوۃ العلماء): دارالعلوم، ندوۃ العلماء، لکھنؤ (اصح المطابع محمود نگر) ص ۵

۲۹۔ علامہؒ نے ان خیالات کا اظہار اپنے ایک مضمون "عبدالکریم الجیلی کا نظریہ توحید" میں کیا ہے، ملاحظہ ہو مظفر حسین برنی: اقبال، چنڈی گڑھ، بھارت، ۱۹۸۵ء، ص ۷۱، ۷۲

۳۰۔ ابوالکلام آزاد: مسلمان عورت، ص ۱۳، (یہ کتاب دراصل ایک مصری عالم فرید وجدی کی کتاب "المراۃ المسلمتہ" کا نقش ثانی ہے)

۳۱۔ محمد الفاروقی: سوانح حیات: شاہ محمد حسین، الہ آباد، ص ۵۴ (ط۔ ادارہ نوامیس الھدیٰ)

۳۲۔ سہ روزہ "مدینہ" ۱۷ر دسمبر ۱۹۴۸ء، بحوالہ مکتوبات شیخ الاسلام، دیوبند، ۱۹۶۳ء، ج ۱، ص ۳۴ (مقدمہ)

۳۳۔ سرسید مرحوم نے، مولانا یعقوب نانوتوی کے خط پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: "پس یہ کہنا کیسا بے جا تعصب ہے کہ ہر گاہ اس مدرسہ میں شیعہ بھی ہوں گے، اس لیے ہم شریک نہیں ہوتے، خدا کرے کہ وہ یہ خیال فرما کر کہ ہندوستان میں بھی شیعہ رہتے ہیں، مکہ معظمہ کو

سدھاریں، مگر افسوس ہے کہ میں سنتا ہوں کہ حج و طواف میں بھی شیعہ موجود ہوتے ہیں۔"

مقالات سرسید، لاہور، ج ۱۰، ص ۱۲۵

۳۴۔ مدینہ، بجنور، ۲۸ر مئی ۱۹۶۲ء ص ۲۔۶

۳۵۔ ایضاً: ۲۸ر جون ۱۹۶۲ء، ص ۲

۳۶۔ جمعیت العلمائے ہند، اسلام آباد، ۱/۲۵۹

۳۷۔ رسل: تاریخ فلسفہ غرب، لندن، ۱۹۵۵ء، ص ۸۱۲